7-8-9
1962

جولائی تا ستمبر 1962

13
1

جولائی اگست ستمبر 62

خلافت لائبریری ربوہ

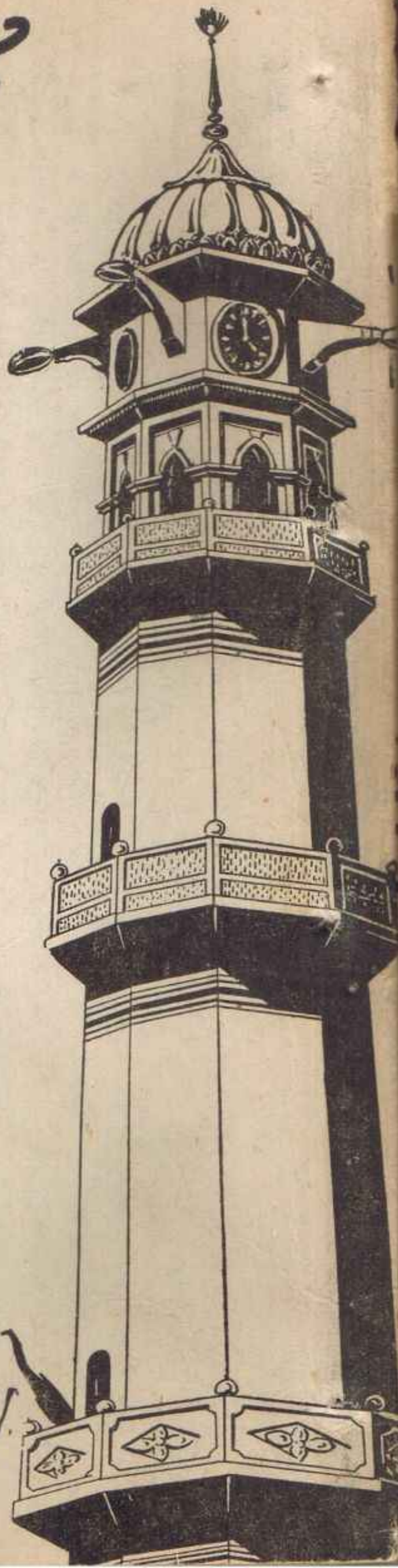

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (الاعراف)

"بخرام کہ وقتِ تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں بر منار بلند تر محکم افتاد"

روشنی اور رفعت کا نشان

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

علم و عمل

سرپرست:- صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب پرنسپل

نگران:- چوہدری محمد شریف خالد

مدیر:- رشید احمد جاوید

جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۶۲ء

جلد ۱۳ شمارہ ۱

پرنٹر و پبلشر:- جنید ہاشمی - مطبع:- ضیاء الاسلام پریس - سرورق:- نصرت آرٹ پریس

ربوہ

ترتیب

٥ اداریہ	مدیر	۳
٥ ایرانی رسم الخط	سجاد امام ایم۔ اے	۹
٥ خدا کی تحقیق اور اس کے ذرائع	پروفیسر حبیب اللہ خان ایم۔ ایس سی	۱۲
٥ احساس کمتری	محمد علی اولڈ بوائے	۱۸
٥ دنیا کا سب سے بڑا جرنیل	چوہدری محمد نواز ایف۔ اے سال دوم	۲۱
٥ تعلیم الاسلام کالج گھٹیالیاں (تعارف)	پروفیسر محمد عثمان ایم۔ اے	۲۲
٥ ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو سہارا نہ ملا (افسانہ)	زرتشت منیر احمد خان	۲۳
٥ موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو اے دل (افسانہ)	رشید جاوید	۲۵
٥ ناقابل فراموش	انعام اللہ ہاشمی بی۔ اے سال اول	۳۷
٥ کفرانِ نعمت (افسانہ)	سیف الزمان ایف۔ اے سال دوم	۳۹

حصہ نظم

٥ دینِ محمدؐ	حضرت بانی سلسلہ احمدیہ	۴۱
٥ آنکہ در خوبی ندارد ہمسرے	" " "	۴۲
٥ وردِ اسلام	حضرت امام جماعت احمدیہ	۴۳
٥ غزل	پروفیسر محمد شریف خالد	۴۴
٥ غزل	شیخ روشن دین تنویر	۴۵
٥ غزل	قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل	۴۵
٥ غزل	ارشد ترمذی	۴۶
٥ چراغِ شب	ہدایت اللہ ہادی	۴۷
٥ زخمی یاد	نعیم قدسی	۴۵
٥ غزل	عبدالسلام اختر	۴۸

اداریہ

تعلیمی اصلاحات

اس فرصت میں ہم ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھا رہے ہیں جس پر تا دمِ تحریر بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے "تعلیمی اصلاحات" ملک کے طلبہ کا ایک داخلی معاملہ ہے اور ملک کا ہر طالب علم اس ضمن میں طلبہ کے سامنے اپنی آزادانہ رائے پیش کرنے کا حق رکھتا ہے۔ آئیے اپنی رائے پیش کرتے سے پہلے ہم آپ کو تعلیمی اصلاحات کے نفاذ سے قبل کے زمانہ میں لے چلیں۔ جب ہم "پرائمری کلاسز" میں پڑھتے تھے۔ تو ہم نے اکثر سنا کہ ہمارا تعلیمی نظام بہت فرسودہ ہے اور اس میں اصلاح کی بہت گنجائش ہے۔ "مڈل کلاسز" میں بھی ہمارے کان یہی "واویلا" سنتے رہے۔ جب ہم "ہائی کلاسز" کے طالب علم تھے تو اس وقت بھی ہمارے کانوں میں یہی آواز پڑی کہ آج کا "میٹریکولیٹ" ربع صدی قبل کے مڈل پاس سے بھی کم اہمیت رکھتا ہے۔ اہل الرائے بزرگوں اور پرانے تعلیم یافتہ حضرات کی زبانی یہ کلمات سن کر ہمارے دلوں میں قدرتی طور پر سخت احتجاج پیدا ہوتا۔ آخر ہمارے دور کے نوجوانوں نے کیا گناہ کیا ہے کہ انہیں ایک ایسا نظامِ تعلیم دیا گیا ہے۔ جو انہیں ایک "کامیاب کلرک" بھی نہیں بنا سکتا۔ اعلیٰ عہدے اور عالمانہ نقطۂ نگاہ تو الا ماشاء اللہ دور کی بات ٹھہری۔

الغرض زمانہ ماقبل اصلاحات کئی قسم کی مایوسیوں اور کمزوریوں کو لئے ہوئے تھا اور ہم یہ بات بلا تامل تسلیم کرتے ہیں کہ اصلاحات سے پہلے کیا اساتذہ اور کیا طلبہ سب پرانے نصابِ تعلیم سے مایوس ہو چکے تھے۔ ہمارا یہ اعتراف بلا ثبوت نہیں۔ اس زمانہ کے اخبارات کی ورق گردانی صاف بتاتی ہے کہ ہر روز کالموں کے کالم "نظامِ تعلیم" پر خامہ فرسائی کے لئے وقف تھے۔ مزاح نگار، طنز نگار، فکاہی کالم نویس، شاعر، ادیب اور سنجیدہ و غیر سنجیدہ لوگ سبھی نے "نظامِ تعلیم" کو مشقِ سخن بنایا ہوا تھا۔ آرٹسٹوں کے کارٹون تک ہمارے "نظامِ تعلیم" میں گھس آئے تھے۔ کہیں طالب علم کی گت بن رہی ہے تو کہیں استاد قابو آیا ہوا ہے۔ ہر طرف بے چینی اور اضطراب کا دور دورہ تھا۔ راقم الحروف کے خیال میں اگر مابعد تقسیم کے تمام اخبارات کے صرف اداریے ہی اس تعلق میں اکٹھے کئے جائیں تو ان کی تعداد کئی سو ہو گی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہمیں امتحانی پرچوں میں "ہمارے تعلیمی نظام کی خامیاں" وغیرہ موضوعات پر مضامین لکھنے کے لئے کہا جاتا تھا اور اس بات کی تصدیق آج بھی یونیورسٹی کے پرچہ جات کے ریکارڈ سے کی جا سکتی ہے۔ تعلیمی اداروں کے پرچہ جات اس کے علاوہ ہیں۔

آخر ایک وقت آیا کہ اس بے اطمینانی کا حل سوچنے کے لئے ایک "قومی تعلیمی کمیشن" کی تشکیل عمل میں لائی گئی کافی غور و فکر کے بعد کمیشن نے ایک جامع رپورٹ مشتمل بر تعلیمی اصلاحات حکومت کو پیش کی۔ ہم اس رپورٹ کو تعلیمی اصلاحات کے سلسلہ میں حرف آخر یا حتمی کوشش قرار نہیں دیتے۔ نہ ہی ہم یہ کہتے ہیں کہ کمیشن کی تمام سفارشات عن و عن قابل عمل تھیں۔ لیکن ہم اس خیال کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ اصلاحات ملک کے تعلیمی و سماجی نظام میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر سکتی تھیں۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہمارا ملک ہر لحاظ سے پسماندہ ہے (سوائے ہڑ بازی اور ہڑتالوں وغیرہ کے) اس چیز کا ہم پہلے بھی کئی دفعہ ان کالموں میں ذکر کر چکے ہیں۔ اب جبکہ ہمارا ملک ترقی کی جانب رخ کر رہا ہے تو اسے ہر میدان میں ہمارے تعاون کی ضرورت ہے۔ ملکی ترقی کا راز اس بات میں ہے کہ ہم اپنے ملک کو زیادہ سے زیادہ سرمایہ مہیا کریں (Capital Formation)

اب پیدائش سرمایہ کی دو صورتیں ہیں۔ مادی اور علمی۔ جہاں تک مادی سرمایہ کا تعلق ہے ہمارا ملک اس لحاظ سے بہت ہی غریب ہے، چنانچہ ہمیں ہر سال بھاری مقدار میں غیر ملکی امداد پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو علمی سرمایہ ہے۔ ہمارے ملک کی پوزیشن اس لحاظ سے یہ ہے کہ سائنسی ریسرچ کا میدان خالی پڑا ہے۔ اس کی تمام ضمنی شاخیں تشنۂ تحقیق ہیں۔ انڈسٹری، ایگریکلچر اور میڈیسن وغیرہ تمام شعبے ہمارے طلبا کو ریسرچ کی عام دعوت دے رہے ہیں۔ اکنامک ریسرچ کا میدان خالی پڑا ہے اور اس کی تمام سب برانچیز (Sub-Branches) وسیع پیمانے پر تحقیق و تفتیش کی محتاج ہیں، پھر سوشل ریسرچ کا میدان ہے وہ بھی خالی پڑا ہے۔ الغرض وہ کونسا شعبہ ہے جس میں ہمیں سکالرز (Scholars) اور محققین کی ضرورت نہیں۔ اب یہ تو ہوا کہ ہم نے مادی سرمایہ کسی نہ کسی طریق سے حاصل کر لیا۔ لیکن اس سے پورا پورا فائدہ (Maximum (Social) Advantage) اٹھانے کے لئے ہمیں اعلےٰ علمی استعداد رکھنے والے افراد قوم کی ضرورت ہے۔ کونسا نظام تعلیم ہمیں یہ افراد مہیا کرے گا؟ یہ مسئلہ آج بھی ملکی ترقی کے منصوبے تیار کرنے والوں کے لئے ایک اہم اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ہمیں یہ حقیقت کبھی نہیں بھولنی چاہئے۔ کہ ہم غیر ملکی ماہرین اور محققین کو بھاری تنخواہیں دے کر ان کی مدد سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ اب ہم اپنے ملک کے ذہین و فہیم طلباء سے ایک دردمندانہ اپیل کرتے ہیں اور وہ یہ کہ وہ سوچیں اور ٹھنڈے دل سے غور کریں کیا پرانے نظام تعلیم نے ہمیں "علمی سرمایہ" کے لحاظ سے ہمیشہ غیر ملکی اقوام کا محتاج نہیں رکھا؟ اور اگر رکھا ہے تو کیا یہ بات ملکی سالمیت کے لئے ایک شدید خطرہ نہیں؟ وہ نظام تعلیم ایک غیر قوم نے ہمارے لئے ترتیب دیا تھا، اس میں اس کے بعض ذاتی مفاد بھی تھے۔ آزاد قوم کی حیثیت سے ہمیں قوم کے تشکیل کردہ نظام تعلیم کو اپنانا ہوگا۔ چلو ہم نے مادی سرمایہ کی امداد لے لی۔ لیکن اگر اس امداد کا ایک حصہ کثیر پھر بھی ہم نے غیر ملکی ایکسپرٹس (Foreign Experts) پر ہی خرچ کر دیا تو کیا اس طرح ہمارا ملک جلد

خوشحالی سے ہمکنار ہو سکتا ہے ہرگز نہیں۔ پس "نئی تعلیمی اصلاحات" کا سب سے زیادہ تعمیری پہلو یہ تھا کہ اس سے ملک میں سکالرز (Scholars) اور محققین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو سکتا تھا جو کم از کم اس "علمی سرمایہ" کی پیدائش کا خلا تو پر کر سکتا۔

اب یہ سب کچھ معلوم کر کے اپنے ملک کے طلبہ پر کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ایسے وقت میں نئے تعلیمی نظام کو التوا میں ڈلوا دیا جبکہ قوم اس کے پھل چکھنے والی تھی۔ اس باغبان کی کیا حالت ہوگی کہ جس کے باغ کے پھل عین اس وقت زمین پر آ رہیں جبکہ ان کے پکنے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہو۔ نئے نظام تعلیم میں بعض کمزوریاں ضرور تھیں۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے مگر پرانے نظام تعلیم میں کب کم تھیں۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس میں خامیوں کا پلڑا بہت ہی بھاری ہے۔ نئے نظام تعلیم میں ایک خامی کافی نمایاں تھی (اگر دیکھا جائے۔ تو وہ ہر دو نظاموں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے) اور وہ یہ کہ اس سے غریب طلباء پر تعلیم کا دروازہ بند ہونے کا شدید خطرہ تھا۔ یہ طریق کار کی ایک کمزوری تھی۔ اور اگر ارباب حکومت پر اس کے اثرات کو اچھی طرح واضح کر دیا جاتا۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ حکومت قومی مفاد کے پیش نظر مالی تکالیف کی شکایت کو رفع نہ کرتی۔ یہ ایک جائز شکایت تھی۔ اور نہایت پر امن طریق سے حکومت کو منوایا جا سکتا تھا مگر طلباء کا یہ مطالبہ کہ نئے نظام تعلیم کو بالکل ہی منسوخ کر دیا جائے۔ اور پھر اس مطالبہ کو باصرار منوانا بہت ہی قابل افسوس ہے۔ جو ہماری قوم کے اندر قومی روح کے فقدان پر دلالت کرتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی تلخ حقیقت ہے کہ حالیہ مظاہروں میں طلبہ نے حد درجہ انتہا پسندی سے کام لیا۔ ہمیں یہاں اس بحث میں نہیں الجھنا کہ ان مظاہروں کے پس پشت کون سے عناصر تھے۔ اور ان کے کیا مقاصد تھے۔ ہم ملکی سیاسیات سے اپنا دامن بچاتے ہوئے اور اس امر کو حکومت کا ایک داخلی معاملہ تصور کرتے ہوئے صرف طلبہ کے ذہنوں کو جھنجھوڑنا چاہتے ہیں۔ آخر انہوں نے ایک ایسے نظام تعلیم کے حق میں نعرے لگا کر جسے دنیا کے اکثر ترقی یافتہ ممالک برسوں پیشتر ترک کر چکے ہیں کونسا فائدہ عظیم حاصل کر لیا ہے۔ یا کونسی گراں قدر ملکی یا قومی خدمت سرانجام دے دی ہے۔ کم از کم ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا۔ کہ اس رجعت پسندی سے ہم مستقبل قریب میں دنیا کی کتنی قوموں سے علمی برتری کا سکہ منوا لیں گے؟ — اے ملک عزیز کے ہونہارو! دنیا تو علمی ترقی کے میدان میں تم سے بہت آگے — ہاں بہت ہی آگے — جا پڑی ہے۔ تمہارے ملک اور قوم کا وقار "نعرہ بازی میں برتری" لے جانے میں نہیں۔ تمہاری ملت کی سربلندی تو اس بات میں ہے کہ جب بھی کسی علم کے نامور خدمتگاروں کا ذکر آئے تو تمہارے ملک کا نام سرفہرست ہو۔ کیا تمہیں یہ سرفرازی اور عزت افزائی قبول نہیں؟ سہل انگاری سے تو کام چلنے سے رہا۔ تسلیم کہ حکومت شرافت سے کام لیتے ہوئے ہمارے مطالبات مان لے گی مگر مطالبات کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔ آپ کے "جائز مطالبات" کی کوئی واضح تعریف ہونی چاہئے۔ اب اگر ایک طالب علم فیل ہو جاتا ہے۔ تو اس میں حکومت کا یا نظام تعلیم کا کوئی قصور نہیں! چاہئے تو یہ تھا کہ طالب علم مذکور

اپنے لائحہ عمل پر غور کرتا اور اپنی ناکامی کی اصل وجہ ڈھونڈتا
مگر ہوتا کیا ہے وہی طالب علم اپنے جیسے چند اور طلباء کو
ساتھ ملا کر اور مظاہرے کر کے اپنے آپ کو پاس ہونے والوں
کی فہرست میں شامل کروا لیتا ہے۔ لیکن دانشمند اسے بھی
خدمت کا نام دے گا؟ یہ تو تخریب ہے! سراسر تخریب!!
یہ فعل تو ملک کی پیشانی پر کلنک کا ایک ٹیکہ ہوگا۔ اب
بار جواب آپ پر کیا آپ کی غیرت یہ بات برداشت کرنے
کو تیار ہے۔ جب ایک غیر ملکی یونیورسٹی کا طالب علم یہ کہے
کہ پاکستانی طالب علموں کے تو کیا کہنے انہیں تو مفت میں
ڈگری مل جاتی ہے۔ سارا سال آوارہ گردی کرو، فلمیں دیکھو،
تھیٹروں میں دل بہلاؤ، پارکوں کی سیر کرو اور امتحان کے
بعد اگر فیل ہونے کا ڈر ہو تو شور مچا دو کہ پرچے بہت مشکل
تھے بہت ناانصافی ہوئی ہے۔ گریس مارکس
(Grace Marks) دیئے جائیں۔ اور
اگر مطالبہ منظور نہ ہو۔ تو گھر کے کسی کونے میں بھوک ہڑتال کر کے
بیٹھ جاؤ کیا یہ ترقی یافتہ قوموں کا طریق ہوتا ہے؟ کیسے
تہذیب اسی کا نام ہے؟ ہمارا روئے سخن ملک و قوم
سے ہمدردی رکھنے والے طلبہ سے ہے۔ بتائیے ایسی
سستی ڈگری لے کر آپ اقوام کی دوڑ میں کیا کردار ادا
کر سکتے ہیں؟ اگر قومی غیرت ہے تو اٹھو اور تمام دنیا
کو للکار دو۔ کہ خبردار ہمارے متعلق ایسی باتیں مت بناؤ۔
ہم تم سے اعلیٰ نظام تعلیم جاری کروائیں گے اور پھر اس
نظام کے نافذ کرنے والوں سے ایسا تعاون کریں گے۔
کہ ابھی ایک نسل کا دور بھی گذرنے نہیں پائے گا کہ ہم
تمام دنیا پر اپنی علمی برتری ثابت کر دکھائیں گے۔ اے

غیور دلو! ماضی کے جمود اور بے حسی کو توڑ دو۔ اپنی برائی
اور بھلائی میں امتیاز کرنا سیکھو۔ دیکھو! غیر تمہیں کہیں گے
کہ انہیں تو اتنا بھی شعور نہیں کہ اچھے بُرے میں تمیز
کر سکیں۔ اپنے حریف پڑوسی ممالک سے ہی ڈرو۔ کیا یہ
طعن برداشت کر لوگے کہ ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ذاتی مفادات سے بالا ہو کر غور و فکر کی عادت ڈالو
قومی سوچ کو اپنے دلوں میں داخل ہونے دو۔ اسے کیوں
روکتے ہو؟ تمہیں صرف خود ہی زندہ نہیں رہنا بلکہ دنیا
کی تمام اقوام کو زندگی کا سبق دینا ہے۔ پھر تم ہمت، صبر،
استقلال، ایثار اور قربانی کو کیوں اپنا شعار نہیں بناتے
نئی تعلیمی اصلاحات کا بار یقیناً تم پر پڑا۔ تمہیں زیادہ محنت
کرنی پڑی، زیادہ وقت تعلیم میں صرف کرنا پڑا۔ زیادہ مالی
مشکلات اور پریشانیاں اٹھانی پڑیں، ڈگری کیلئے ایک سال
زیادہ انتظار کرنا پڑا۔ لیکن برادران ذرا دور کی سوچیئے۔ آپ کی ہمت
و استقلال اور ایثار و قربانی کی بدولت بھی وقار پر کیسا
خوشگوار اثر پڑا۔ پہلے آپ مادی سرمایہ کے لئے بھی غیروں
کے محتاج تھے اور علمی سرمایہ کے لئے بھی انکے دست نگر۔
مگر اب کم از کم علمی سرمایہ میں تو خود کفیل ہو گئے
اب غور کرو نئی اصلاحات کو معرض التوا میں ڈالنے
سے کس قدر پیچھے جا رہے ہیں۔ ابھی وقت ہے اٹھو اور
کمر ہمت کس لو۔ اپنے تمام مدمقابل طالب علموں کو چیلنج
دے دو کہ دیکھو ایک بیدار قوم کے نوجوان تمہارے
پیچھے آ رہے ہیں، چھوڑ دو تمام۔ اسکول کو ان کے لئے
دو، اپنی قوم کی سربلندی کے لئے ایک کسی بھی قربانی سے

دریغ نہیں کریں گے۔ دیکھو! دیکھو!! انہیں آگے بڑھنے دو۔ ایک مستحکم قوم کے افراد ہونے کے لحاظ سے ان کا زیادہ حق ہے کہ وہ علمی دنیا کے تمام شعبوں کے لیڈر رہیں۔ پیشرو ہوں۔ لیکن اے قوم کے ہونہارو! اگر تم غفلت کی اس نیند سے نہیں جاگتے (اور زمانہ تمہیں پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ وقت خواب نہیں، یہ وقت خواب نہیں!) تو یاد رکھو کہ آنے والی نسلیں تمہارے اعتذار کو کبھی قبول نہیں کریں گی۔ تم صرف اپنے قدموں پر کلہاڑی نہیں چلا رہے بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کی قسمتوں کو بھی تبدیل کر رہے ہو۔ دیکھو اگر خوشحال نسل کے آباؤ اجداد بننا چاہتے ہو تو تمہیں بہر حال قربانی کرنا پڑے گی۔ مالی کی طرف دیکھو کہ وہ کتنی محنت اور تکلیف سے باغ لگاتا ہے مگر اب اوقات اس باغ کا پھل کھانے سے قبل ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ اور اگر کھاتا بھی ہے تو بہت تھوڑا۔ لیکن کیا وہ اس وجہ سے اس تمام محنت سے کنارہ کشی کرے۔ نہیں نہیں ایک دور اندیشی اور اپنی اولاد کا غم اور درد رکھنے والا مالی ہرگز یہ بات نہیں سوچ سکتا۔ وہ اپنے آپ کو ایک خوش حال اور فارغ البال نسل کا باپ یا دادا دیکھنا زیادہ پسند کرے گا۔ پس ذاتی مفادات کی قربانی اور عظیم الشان ایثار کا مظاہرہ کئے بغیر قومیں کبھی ترقی نہیں کر سکتیں۔ ہمارے تعلیمی نظام میں نئی اصلاحات کی بھی جگہ رکھنی تھیں جو زراعت میں جدید اور سائنٹیفک مشینوں کا استعمال رکھتا ہے۔ پس کس قدر بد قسمت ہے وہ قوم جسے جدید مشینیں اور سائنٹیفک آلات مہیا کئے جائیں۔ مگر اس کے باوجود وہ صدیوں قبل کے ہل اور سہاگہ کے استعمال پر مصر رہے۔

پس اے مستقبل قریب میں کشتیٔ ملت کے بننے والے ناخداؤ! سوچو اور غور کرو، پھر سوچو اور غور کرو کہ تم نے اپنی قوم کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لئے کیا کارنامے کئے ہیں۔ اپنے ذہن میں صحت مند انقلاب پیدا کرو۔ کیونکہ اس کے بغیر قوم دوسری قوموں پر سبقت نہیں لے جا سکتے۔ اپنے نقطۂ نگاہ کو محض اپنی ذات تک محدود نہ رکھو بلکہ اپنے ہر فعل میں قومی اور اجتماعی مفاد کو مدِ نظر رکھو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے اذہان کو جلا بخشے اور قوم و ملت کے مفید وجود بننے کی توفیق دے۔

آمین اللّٰھم آمین

المنار

مرسلہ محمد مجیب اصغر

"اَلْمَنَارُ" عربی کا لفظ ہے اور اسکے معنی ہیں "مَوضِعُ النُّور" یعنی روشنی دینے والا مقام۔ اس کے دوسرے معنی ہیں۔ "اَلْعَلَمُ یُجْعَلُ لِلْاِھْتِدَآءِ فِی الطَّرِیْقِ" یعنی وہ نشان جو راستہ میں راہ نمائی وغیرہ کے لئے لگایا جاتا ہے "یہ نشانِ اہتداء" چونکہ عام سطحِ زمین سے بلند ہوتا ہے اس لئے "مَنار" کے لفظ میں "بلندی اور رفعت" کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اسی لئے رسالہ "المنار" کی پیشانی پر "روشنی اور رفعت کا نشان" کے الفاظ لکھے رہتے ہیں۔ المنار تعلیم الاسلام کالج کے ہر طالب علم سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ نہایت بلند کردار اور زبردست بنایانہ صلاحیت رکھتا ہو۔

اسلامی حکومت کا قیام

مرسلہ: غلام رسول آشفتہ

اس وقت ہمارے ملک میں خاص قسم کے طور پر یہ جوش پیدا ہو چکا ہے کہ ملک میں اسلامی حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ حالانکہ سب سے بڑا ملک انسان کا اپنا قلب اور اس کا دماغ ہے۔ مگر اس میں اسلامی حکومت قائم نہیں کی جاتی۔ جوں جوں تعلیم کا رواج بڑھ رہا ہے۔ دین کی طرف رغبت کم ہو رہی ہے۔ تعلیم کو رواج دینا تو ضروری امر تھا۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اس قدر ضروری چیز کو اس طرح ضبط میں لاتے کہ ہمارے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دین کے بھی خادم بنتے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب بچے ہوش سنبھالتے ہیں تو وہ فلمی گانے تو یاد کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر انہیں کہا جائے کہ تم قرآن کریم کی کوئی سورۃ سناؤ تو وہ انہیں یاد نہیں ہوگی۔ میری نصیحت یہی ہے کہ اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر قرآن کریم اور احادیث کے مطالعہ پر بھی صرف کرو۔ اگر آپ روزانہ کچھ وقت قرآن کریم اور احادیث کے مطالعہ میں لگائیں گے اور اس کے احکام پر عمل کریں گے۔ تو آپ لوگوں کے گھروں میں خود بخود اسلامی حکومت قائم ہو جائیگی۔ اور جب آپ لوگوں کے گھروں میں اسلامی حکومت کا قیام ہو جائیگا تو ملک میں اسلامی حکومت کے قیام کے لئے آپ کو زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

(گورنمنٹ کالج لائل پور کے طلبہ سے حضرت امام جماعت احمدیہ کا خطاب)

— بقیہ —

زمیندار کا بیٹا بتاتا ہے" لڑکے نے دوبارہ کہا۔ یہ الفاظ سنتے ہی منیرالدین کے اوسان خطا ہوگئے زمین اس کے پیروں کے نیچے سے نکلنے لگی۔ بڑی جرأت کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور لڑکے سے کہا کہ وہ انور تک اس کی راہ نمائی کرے جب وہ انور کے کمرہ کے نزدیک پہنچا تو اس نے اندر سے آنے والی آوازیں واضح طور پر سنیں۔

"آپ کا باپ تو ایک زمیندار ہے نا؟" ایک لڑکا پوچھ رہا تھا اور اسے "ہاں ہاں" کے الفاظ سے جواب دے رہا تھا۔ "لیکن ایک سیدھا سادا دل میں ملبوس بوڑھا کہتا ہے کہ انور میرا بیٹا ہے"۔ پھر اسی لڑکے کی آواز سنائی دی۔ "یاد آیا وہ ہمارا بوڑھا نوکر ہوگا وہ بھی مجھے پیار سے بیٹا ہی کہتا ہے" انور نے قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ منیرالدین نے پریشانی کی حالت میں ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے دروازہ کھولا اور روپوں کی تھیلی آگے بڑھاتے ہوئے کہا "لو انور! تمہارے ابا نے تمہیں پیسے بھیجے ہیں" پھر وہ جلدی سے واپس لوٹ آیا۔ یہ الفاظ "یاد آیا وہ ہمارا بوڑھا نوکر ہوگا وہ بھی مجھے پیار سے بیٹا کہتا ہے" منیرالدین کی فضائے یادداشت میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے وہ پریشانی اور تکلیف کی حالت میں ہوسٹل سے باہر نکل آیا اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا — "اے دنیا والو! مجھے تمہارا یہ تمدن نہیں چاہیئے۔ یہ تہذیب کہ بیٹا باپ کو نوکر سمجھنے لگے مجھے منظور نہیں میں تھوکتا ہوں اس دنیا پر جس میں خونی رشتے قطع ہو جائیں اور بیٹا باپ کی تمیز نہ کر سکے"۔ یہ کہتے ہوئے بوڑھا منیرالدین ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا

سجاد امام ایم۔اے

ایرانی رسم الخط (قدیم وجدید)

ایران میں سب سے پہلے ہمیں جس رسم الخط کا نشان ملتا ہے وہ "میخی" رسم الخط ہے۔ اس کو میخ کی شکلوں کے ذریعہ جو کہ عمودی یا افقی صورت میں ہوتی تھیں ظاہر کیا جاتا تھا اور اسے بائیں جانب سے دائیں جانب کو لکھتے تھے۔ یہ رسم الخط جہاں تک معلوم ہو سکا ہے سومریوں کا ایجاد کردہ ہے اور اس میں اہم علامتیں ہیں۔ ہخامنشی خاندان کے بادشاہوں نے کتبے بھی کندہ کرائے جن میں سے بعض بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایران کی قدیم ترین زبان "فارس قدیم" یا فارسی باستان" کا سراغ بھی انہی کتبوں کے ذریعہ ملتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے بھی ان کی بہت اہمیت ہے۔ کیونکہ ان کے ذریعہ بادشاہوں کے حالات اور حدود سلطنت اور لڑائیوں اور فتوحات کا پتہ چلتا ہے۔ ایرانی میخی رسم الخط دوسرے میخی خطوں کی نسبت سادہ اور صحیح ہے۔ مثلاً بابلی رسم الخط میں میخوں کی شکل افقی اور عمودی کے علاوہ دوسری شکلوں میں بھی مروج تھی جس کی وجہ سے وہ بہت پیچیدہ ہو گیا تھا۔

اس رسم الخط کے بعد ایران میں "پہلوی رسم الخط" رائج ہوا۔ یہ آرامی رسم الخط سے اخذ کیا گیا تھا اور اس کی اقسام دو تھیں۔ "رسم الخط پہلوی اشکانی" اور "رسم الخط پہلوی ساسانی" ان دونوں اقسام میں یہ دائیں سے بائیں جانب لکھا جاتا تھا۔ اس رسم الخط کا سراغ "نقش رستم" اور "نقش رجب" کے کتبوں سے ملتا ہے۔ جو کہ ساسانی بادشاہوں نے یونانی اور پہلوی زبان میں لکھوائے تھے۔ یہ لکھنے اور پڑھنے میں بہت پیچیدہ تھے۔ "پہلوی اشکانی رسم الخط" اور "پہلوی ساسانی رسم الخط" میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ پہلا اشکانی دور میں مروج تھا اور دوسرا ساسانی عہد میں۔

اس رسم الخط کے بعد ایران میں "اوستائی رسم الخط" کا پتہ ملتا ہے جن پرنیال کے نزدیک اس کی اہم الف بائی علامتیں ہیں۔ یہ قدیم ایرانی رسم الخط سب سے زیادہ آسان اور مکمل ہے۔ چونکہ زرتشتیوں کی کتاب "اوستا" کو اس رسم الخط میں لکھا گیا۔ اس لئے اس کا نام اوستائی پڑ گیا۔ یہ دائیں سے بائیں جانب کو لکھا جاتا تھا۔

ترکستان اور طومان میں تحقیقات سے ایک ایرانی "سغدی" کا پتہ چلا ہے۔ یہ تحقیقات ۱۹۰۰ء میں شروع ہوئیں جس کے نتیجہ کے طور پر جو کہ "سغدی رسم الخط" میں لکھی ہوئی تھی۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ رسم الخط آرامی رسم الخط سے لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ پہلوی رسم الخط کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی آرامی سے اقتباس شدہ ہے۔

ایران کے مشہور شخص مانی نے "مانی رسم الخط" ایجاد کیا۔ یہ بھی آرامی رسم الخط سے اقتباس شدہ ہے۔ مانی سلسلہ کی کتابیں اس میں لکھی گئیں جن میں سے بعض اب دستیاب ہوئی ہیں۔

ابن الندیم نے ابن المقفع کے قول سے بتایا ہے کہ ایرانی سات رسم الخط رکھتے تھے۔

(۱) خط دین دفیریہ (یا دین دبیریہ): یہ اوستائی رسم الخط کا دوسرا نام ہے۔ مسعودی نے بھی اوستا کی الف۔ب کو دین دبیرتہ کے نام سے ذکر کیا ہے۔ اس کے قول کے مطابق اس میں ۶۰ حروف ہیں۔

(۲) ویش دبیریہ: اس میں ۳۶۵ حروف ہیں۔ اس میں قیافہ شناسی اور فراست کے متعلق کتابیں لکھی جاتی تھیں۔

(۳) گشتگ رسم الخط: اس میں شاہوں کے سکے مہریں اور قرار دادیں لکھی جاتی تھیں۔

(۴) خط نیم گشتگ: اس میں فلسفہ اور حکمت سے متعلق کتابیں لکھی جاتی تھیں۔

(۵) شاہ دبیریہ: یہ رسم الخط صرف بادشاہوں کے لئے مخصوص تھا۔

(۶) نام دبیریہ: اس میں بادشاہوں کے علاوہ تمام طبقات کے لوگ تحریریں وغیرہ لکھتے تھے۔ اس رسم الخط میں نقطے نہیں تھے۔ اور بعض عبارات بابلی لغت میں لکھی جاتی تھیں مگر انہیں پڑھا فارسی میں جاتا تھا۔ اور اس کو "ہزوارش" کہتے تھے۔ یہ کلمات ہزار کے قریب تھے۔ مثلاً گوشت کی بجائے "بسرہ" لکھتے تھے اور پڑھتے گوشت تھے۔

(۷) رازسہریہ: اس میں بادشاہ خارجی ممالک کے ساتھ تعلقات اور ان کے راز وغیرہ رکھتے تھے۔

ان کے علاوہ جو رسم الخط دیگر کتبوں، سکوں اور برتنوں کے نقوش کی صورت میں ملے وہ یہ ہیں۔

(۱) خط اشکانی قدیم: یہ رسم الخط پرانے آرامی خط سے مشابہ ہے۔

(۲) خط اشکانی جدید: اشکانی قدیم سے معمولی تفاوت رکھتا ہے۔

(۳) خط کتبہ ہائے ساسانی: ساسانی کتبوں سے ملتا ہے۔

(۴) خط تحریری ساسانی: اس میں خطوط لکھے جاتے تھے

یہ تمام رسم الخط ایران میں اسلام کی آمد سے پہلے رائج تھے۔ اسلام کی آمد کے بعد پہلوی رسم الخط مشکل ہونے کی وجہ سے زوال پذیر ہوگیا۔ اور صرف زرتشتی معبدوں تک محدود ہو کر رہ گیا اور ایران میں عربی رسم الخط کا رواج ہوا۔ اسلامی مورخین کے قول کے مطابق "عربی رسم الخط" حیرہ سے جو کہ نصرانیوں کا پایہ تخت تھا اختیار کیا گیا۔ اس روایت کو عبداللہ بن عباس اور بعض ابن اسحاق صاحب السیرۃ النبویہ سے منسوب کرتے ہیں۔ مسعودی حمزہ بن حسن اور دوسرے علماء اس پر متفق ہیں:

ابن عباس کہتے ہیں کہ عربی رسم الخط کی بنیاد قبیلہ بنی طے کے تین اشخاص نے رکھی۔ انہوں نے حروف اختیار کئے اور ان پر موم لگایا۔ مسعودی کے نزدیک محض بن جندل کے بیٹوں نے عربی رسم الخط ایجاد کیا۔ بعض روایات کے مطابق حضرت

اسمٰعیل علیہ السلام نے اس خط کو وضع فرمایا۔ ابن ہشام حمیر بن سبا کو اس رسم الخط کا موجد ٹھہرایا ہے۔

آجکل کے محققین کا عقیدہ ہے کہ خطِ اسلامی خطِ نبطی تازہ سے لیا گیا ہے۔ جو طور سینا کے جزیرہ سے منتشر ہوئے۔ اس عقیدہ کے ثبوت میں سب سے قدیم چیز جو دستیاب ہوئی ہے وہ نقش نمارہ کا کتبہ ہے اس کی تاریخ ۳۲۸ء ہے۔ اس کے علاوہ نقش حران کا کتبہ بھی ملا ہے جو کہ ۵۶۸ء میں بنایا گیا تھا۔

بہرحال اسلامی خط جزیرۂ طور سینا سے ظہور پذیر ہو کر شام اور بنی غسان کے تاجروں میں رواج پا گیا۔ اور انہیں کے ذریعہ بڑے بڑے تجارتی مراکز میں منتقل ہو گیا۔

بعض کے نزدیک عربوں اور حبشیوں نے اس رسم الخط کو یمن سے اخذ کیا۔ لیکن پہلا نظریہ صحیح ہے کہ عربی رسم الخط قبطی رسم الخط سے اور قبطی رسم الخط آرامی رسم الخط سے اخذ کیا گیا ہے۔ عربی رسم الخط کی قدیم ترین اسناد نقش حبط اور نقش حران ہیں۔ عبدالرحمٰن بن جبیر مورخ کی قبر کا کتبہ بھی اسی رسم الخط میں ہے۔ اسی رسم الخط سے کوفی اور نسخ دو رسم الخط بنائے گئے۔ بعد میں ان دونوں میں لوگوں کی معاشرت اور ہر ایک میں خوش نویسوں کی طرف سے اصلاحات اور اضافہ کی وجہ سے بہت فرق پیدا ہو گیا۔

کوفی رسم الخط بہت جلد ترقی کر گیا۔ اور اس میں ایسے عالم لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اس کے حروف بنائے اور عام رواج دیا۔ اس لئے قرآن مجید اور دوسری کتابیں اس میں لکھی گئیں۔ سب سے پہلے ابوالاسود نے نقطے اور حرکت کے نشانات وضع کئے۔

ابن الندیم کے قول کے مطابق اسلامی سلطنت کے آغاز پر چار رسم الخط موجود تھے۔ (۱) مکی (۲) مدنی (۳) بصری (۴) کوفی

نویں اور دسویں صدی میں نسخ کی اصلاح کی گئی۔ اور نستعلیق رسم الخط وجود میں آیا۔ سب سے پہلے جس شخص نے اسے اچھی صورت میں لکھا وہ میر علی تبریزی تھے۔ ان کے بعد ہرات کے میر علی ملا جعفر تبریزی اور سلطان حسین نے اس میں اصلاحات کیں۔ آخر میں جس شخص نے اس کو عروج پر پہنچا دیا وہ میر عماد قزوینی تھے۔

اس رسم الخط نے اسلامی دنیا میں رواج پایا۔ اور آجکل ایران۔ پاکستان۔ ہندوستان اور افغانستان میں استعمال ہوتا ہے۔

(سبک شناسی از ڈاکٹر بہار۔ ایران باستان از حسن پیرنیا سے استفادہ کیا گیا)

نظرِ انتخاب

تصورات میں خنداں تمہاری یاد کے زخم
تخیلات میں رقصاں تمہاری یاد کے پھول

تمہاری یاد میرے دل کے آبگینے میں
تمہاری یاد میری روح کے خزینے میں

جب تم ہی پیش آنے لگے بے رخی کے ساتھ
پھر کیا نبھائیں رشتۂ الفت کسی کے ساتھ

اک اک اشک میں شمع فروزاں ہوگی
جب تیری یاد میرے دل میں غزل خواں ہوگی

مرسلہ: عابد علی عابد

پروفیسر حبیب اللہ خان ایم اے بی ایس سی

خلا کی تحقیق اور اس کے ذرائع

جب بھاری بھرکم راکٹ اپنے مچان سے اٹھتا ہے۔ تو وہ اپنے منہ سے سرخ و سفید شعلے اگل رہا ہوتا ہے۔ دھوئیں اور حرارت کے بادل اس کے نیچے اوپر چاروں طرف پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ انجنوں کا شور اور ہنگامہ قیامت خیز ہوتا ہے۔ اور ہر طرف آگ ہی آگ نظر آتی ہے۔

مچان سے دو فرلانگ دور وہ لوگ جو اس کے چلانے پر متعین ہوتے ہیں۔ بہت موٹی دیواروں والی کنکریٹ کی ایک عمارت میں چھپے رہتے ہیں اور تنگ سوراخوں میں سے ساری کارروائی ملاحظہ کرتے ہیں۔ مبادا کہیں راکٹ پھٹ نہ جائے یا اس کی غیر متوقع بے راہ روی انہیں گزند نہ پہنچا دے۔ ان عمارات کو بلاک ہاؤس کہتے ہیں اور وہ ان میں بالکل محفوظ رہتے ہیں۔

اگرچہ راکٹ کے نزدیک قیامت کا سا شور ہوتا ہے۔ اور ایک جہنم منہ کھولے ہوئے نظر آتا ہے۔ تاہم راکٹ کی تیسری منزل میں حیوانی زندگی بھی موجود ہوتی ہے۔ ابتدا میں راکٹ کے اس نوکیلے حصے میں قسما قسم کے جانور رکھ دیئے جاتے تھے۔ لیکن اب حضرت انسان خود بنفس نفیس وہاں موجود ہوتا ہے۔ ذرا تصور تو کیجئے کہ راکٹ میں بیٹھے ہوئے اس انسان نے کن خطرات میں اپنے آپ کو ڈال لیا ہے۔ آگ کے شعلے اس کے چاروں طرف لپک رہے ہیں۔ اگر راکٹ کے ایک پرزے میں بھی خلل واقع ہو جائے۔ تو اس کے جسم کا ڈھونڈے سے بھی پتہ نہیں لگے گا۔ پھر وہ راکٹ میں بیٹھا نہیں ہے۔ جیسے ہم کرسی یا پلنگ پر آرام سے بیٹھ جاتے ہیں بلکہ پیٹھ کے بل ایک کرسی پر پڑا ہے۔ اس کے گھٹنے اوپر کی طرف مڑے ہوئے ہیں۔ اور سارا جسم ڈوریوں سے جکڑا ہوا ہے۔

جب راکٹ کے انجن اپنا کام شروع کر دیتے ہیں تو وہ اوپر اٹھنے لگتا ہے۔ اور لحظہ بہ لحظہ اس کی رفتار میں تیزی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ راکٹ کے انجنوں اور ابلتے ہوئے شعلوں کا شور تو پہلے ہی موجود ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ ہوائی تہوں کو برق رفتاری سے چیرتا ہوا آگے بڑھتا ہے تو شور میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور کان کے پردے پھٹنے لگتے ہیں۔ جوں جوں اس کی رفتار میں تیزی پیدا ہوتی ہے۔ ایک زبردست قوت یعنی کشش ثقل ـــ اس کے جسم اور اس کے اندرونی اعضا کو نیچے کی طرف دبانے لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سینے اور جسم پر پہاڑ کا سا بوجھ آ پڑا ہے۔ اس زبردست دباؤ کے نیچے انسانی جسم مجبور اور معذور ہوتا ہے۔ اور کچھ دیر کے لئے اس کے اعضا و جوارح بے دم سے ہو کر پڑے رہتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دل اور دماغ مفلوج ہو چکا ہے۔ نہ حرکت کا ارادہ باقی ہے نہ تاب و تواں۔

یہ کیفیت اگرچہ بے انتہا شدید ہوتی ہے لیکن چند منٹ سے زیادہ نہیں رہتی۔ رفتہ رفتہ دباؤ کم ہونے لگتا ہے اور شور میں کمی آجاتی ہے۔ پھر انجن پورے طور پر بند ہوجاتے ہیں نہ ارتعاش باقی رہتا ہے اور نہ کوئی ہنگامہ اندر یا باہر چاروں طرف کامل سکون اور خاموشی طاری ہوجاتی ہے۔ بسیط خلا کی خاموشی جہاں نہ ہوا ہے، نہ روشنی، نہ زندگی، نہ حرکت، اس تاریک، غیر مانوس اور ہیبت ناک خلا میں ضعیف البنیان انسان اس طرح داخل ہوجاتا ہے جیسے کوئی اجنبی نووارد کسی لق ودق صحرا میں تنہا چلا جائے۔

شاید اس نووارد کی منزل مقصود نظام شمسی کا کوئی کرہ ہے جس کی طرف وہ کشاں کشاں چلا جا رہا ہے۔ اور اس کی راہ بڑی احتیاط اور بڑے حسابی اندازوں کے بعد متعین ہوچکی ہے۔ حرکت بھی غضب کی تیز ہے ـــ ۷ میل فی سیکنڈ ـــ اور ۲۵۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے۔ تاہم سفر بہت طویل ہے اور شاید کئی ماہ کے بعد ہی وہ منزل مقصود تک پہنچ سکے۔ مشکل یہ ہے کہ منزل اگرچہ متعین ہے۔ لیکن اس کو بھی قرار نصیب نہیں وہ بھی خلائی وسعتوں میں بے پناہ تیزی کے ساتھ مصروف حرکت ہے اور انسان کی مشکلات میں مزید اضافے کا موجب۔

دشواریاں بظاہر بے انتہا ہیں۔ اور ان کا تصور بھی انسان پر لرزہ طاری کر دیتا ہے۔ لیکن خلاباز کو جو راکٹ میں بیٹھا ہے اپنے مشن کی کامیابی پر پورا یقین ہے اسے اس امر کا بھی پورا بھروسہ ہے کہ اس کی تمام ضروریات جہاز میں اور دوران سفر کے لئے محقق ہونگی۔ اس کے حجرہ میں کھانے کے لئے غذا پینے کے لئے پانی اور سانس لینے کے لئے کافی ہوا موجود ہے اور وہ تمام لوازمات جن پر حیات کا دارومدار ہے۔ اس کو چاق وچوبند رکھنے کے لئے وافر مقدار میں فراہم کر دیئے گئے ہیں بقائے حیات اور منزل کو پالینے کے امکانات اس کو کافی روشن نظر نظر آتے ہیں اور اسے اس امر کا بھی یقین ہے کہ اگر بالفرض کوئی حادثہ پیش آجائے اور غیر متوقع حالات ایسے پیش آجائیں کہ خلائی جہاز کو چھوڑ دینے کے سوا چارہ نہ رہے۔ تب بھی وہ سلامتی کے ساتھ مادر وطن، اپنی پیاری زمین کی طرف واپس پہنچ جائے گا۔

اسے یہ یقین اور وثوق کیسے پیدا ہوگیا ہے؟ اسے کس طرح پتہ لگ گیا کہ خلا کی غیر محدود وسعتوں میں جہاں حیات کا نام نشان تک نہیں وہ زندہ و سلامت رہے گا؟ مانا کہ وہ ایک ہوا بند حجرہ میں محفوظ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک مقفل اور بند دھات کے حجرہ میں اس کی زندگی اور بقا کی کیا صورت ہے۔ اور آخر کب تک وہ اس طرح مقید رہ کر زندہ رہ سکے گا؟ کیا اس بند حجرے میں اس کی غذا اور آکسیجن کی ہوا زہر آلودہ نہ ہوجائیگی اسے اپنے منہ سے نکلنے والی کاربن ڈائی آکسائڈ اور دیگر زہروں سے کس طرح چھٹکارا مل سکے گا۔ اسے کس طرح اطمینان پیدا ہوگیا ہے کہ سینکڑوں میل دور خلا میں اس کا جہاز اس کا محدود حجرہ صحیح سلامت رہے گا۔ اور پھر سلامتی کے ساتھ ہی زمین پر واپس لوٹ آئے گا؟

ان تمام سوالات کا جواب یہ ہے کہ وہ تحقیقاتی اور تجرباتی کام جس نے اس کے جہاز کو جنم دیا۔ اسکے پیچیدہ آلات کو مہیا کیا، زندگی کے بقا اور قیام کے تمام ضروری لوازمات کو فراہم کیا۔ اور وہ طویل مشق اور ٹریننگ جو اس نے کئی سال میں اس کام کے لئے حاصل کی۔ اس بات کی کافی ضمانت ہیں کہ وہ اپنے ارادوں میں کامیاب رہے گا۔ وہ اس کی خوشگوار

ہوگی:

خلائی دستوں میں انسان کا یہ تجربہ پہلا نہیں ہے۔ اس سے قبل بے شمار تجربات ہو چکے ہیں اور تقریب دو دو کے فاصلوں کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔ ایک انسان کے خلا میں جانے سے پیشتر آلات بردار راکٹ نزدیک و دور کی سیر کر چکے ہیں اور ریڈیائی لہروں کے ذریعہ بہت سی معلومات زمین تک ارسال کر چکے ہیں۔ مصنوعی سیاروں نے زمین کے گرد بیسیوں مرتبہ گردش کی ہے۔ وہ سب کے سب حساس آلات سے لیس تھے ان میں سے بعض میں حیوانی مسافر بھی موجود تھے جن کے دل کی دھڑکنیں اور سانس کی کیفیات تنفس اور دوران خون کے تغیرات ریڈیو کے ذریعہ زمین تک پہنچ رہے تھے۔ اور یہ امر کا پتہ دے رہے تھے کہ خلا کے غیر مانوس ماحول میں انسانی جسم پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

یہ معلومات انتہائی طور پر ضروری تھیں اور ان پر ہی مستقبل کی کارروائیوں کا دار و مدار تھا۔ اس لئے ان کی صحت کو بار بار اور مختلف طریقوں سے جانچا گیا۔ راکٹ تو چند ہی منٹ خلا میں رہتے ہیں۔ لیکن غبارے بلندیوں میں گھنٹوں گھومتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایک ایک لاکھ فٹ کی بلندی تک پہنچے۔ اور بعض صورتوں میں ۲۰۔۳۰ گھنٹے اوپر رہے۔ ان کے ذریعہ اس امر کا علم ہوا کہ دن اور رات کی تبدیلیوں سے کیا اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ جب راکٹ ہوا کو چیرتے ہوئے اوپر اٹھتے ہیں تو ان سے یہ علم ہوتا ہے کہ مختلف بلندیوں پر حالات کی کیا نوعیت ہے اور فضا کس قسم کی ہے۔

فضا کی کیفیات کا مطالعہ کرنے کے لئے ہوائی جہازوں نے بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف بلندیوں پر انسان کے لئے کس قدر آکسیجن اور کس قدر حرارت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جب شروع شروع میں ہوائی جہاز معرض وجود میں آئے تو ہوابازوں کے سامنے یہ مسائل نہیں آئے تھے۔ لیکن جوں جوں ترقی ہوتی گئی اور ہوائی جہاز زیادہ سے زیادہ بلندی تک پہنچنے لگے۔ تو ہواباز کی نشست گاہ اور اس کے سامان میں مناسب ترمیم ہوتی چلی گئی۔ جب وہ تین میل کی بلندی پر پہنچے تو وہاں ہوا کی مزاحمت میں نسبتاً کمی ہوگئی اور رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی کئی نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ مثلاً جب ہوا کی کثافت کم ہو جائے تو آکسیجن کی مقدار میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور دباؤ اس قدر نہیں رہتا کہ وہ از خود آسانی کے ساتھ انسان کے پھیپھڑوں میں داخل ہو سکے۔

ہوائی جہازوں کے بعد بلند پرواز جیٹ منصۂ شہود پر آئے۔ اب اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہواباز کے لئے کافی آکسیجن اور ہوا کا کافی دباؤ ناگزیر ہے۔ ورنہ اس کا جسم اور اس کا دماغ صحیح طور پر کام کرنے سے قاصر رہے گا۔ اس ضرورت نے نیم دباؤ والے لباس کی طرف راہ نمائی کی۔ اور رفتہ رفتہ اس نے پورے دباؤ والے خلائی لباس والی شکل اختیار کر لی۔ جیٹ جہازوں میں ہواباز ایک بند کمرہ میں بیٹھا ہوتا ہے جس میں ہوا کا دباؤ مناسب حد تک برقرار رکھا جاتا ہے اور اس کی بدولت جیٹ جہاز محفوظ بلندی تک بے دھڑک چلا جاتا ہے:

رفتہ رفتہ ہمت اور کوشش سے بلند پروازی کے ریکارڈ قائم ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آگیا۔ جب جیٹ جہاز ہوا کی لطافت کے باعث مزید بلندی تک پہنچنے سے قاصر ہو گئے۔ اب راکٹوں اور غباروں کا دور شروع ہو گیا۔ راکٹ

تو سیکڑوں میل کی بلندی تک پہونچنے لگے اور ان کے ذریعہ مصنوعی سیارے بھی خلا میں چھوڑے جانے لگے۔ جن کا مدار حسب ضرورت پانچ پانچ ہزار میل تک چلا جاتا ہے۔ کئی لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مصنوعی سیارے جن کا آجکل بہت چرچا ہے آخر ہیں کیا بلا؟ دراصل انسان کے بنائے ہوئے یہ سیارے ایک مکمل مگر بہت ہی چھوٹی سی چلتی پھرتی تجربہ گاہیں ہیں۔ جن کے ذریعہ مختلف قسم کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بعض راکٹ ایسے ہوتے ہیں جو بہت دور تک آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ سورج کے مدار میں پہونچکر اس کے گرد گھومنے لگتے ہیں۔ یہ سیارے مختلف بلندیوں پر کائناتی شعاعوں، زمین کے مقناطیسی اثرات، شمسی توانائی، درجہ حرارت، ہوا کی کثافت شہابیوں کی مقدار اور ان کی رفتار کے بارے میں اطلاعات فراہم کرتے ہیں۔

اگر ہم راکٹوں اور مصنوعی سیاروں کے ساتھ خلا میں جانا چاہتے ہیں تو ہمیں قطعی طور پر معلوم ہونا چاہیئے کہ کس قسم کی اطلاعات کی ہمیں ضرورت ہے اور وہ اطلاعات کس قسم کے آلوں کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ان اطلاعات کی فراہمی کے لئے ضروری ہے کہ ہم غباروں، راکٹوں اور مصنوعی سیاروں کو مناسب آلات سے لیس کریں اور اس امر کا تجربہ کریں کہ خلا میں جانے کے بعد انہیں سلامتی کے ساتھ واپس زمین تک کس طرح لایا جاسکتا ہے۔ کوئی دریافت کرسکتا ہے کہ بالفرض ایک مصنوعی سیارہ کو ضروری آلات سے لیس کردیا گیا۔ لیکن جب اسے زمین پر واپس لانے کی کوشش کی جائے گی تو کیا وہ زمین سے ٹکراکر چکنا چور نہ ہوجائیں گے اور کیا وہ راکٹ کے چلنے کے وقت ان زبردست دھکوں کو برداشت کرلیں گے جو اس کے انجن اسے دیتے ہیں۔ اگر آلات کے ٹوٹنے کا ڈر ہے

تو ان کو مسالہ اور ربڑ سے محفوظ کر دیجئے۔ اور پھر ایسا انتظام کر دیجئے کہ وہ خود بخود مناسب وقت پر راکٹ سے الگ ہو جائیں اور خود کار پیراشوٹ کھل کر ان کو حفاظت سے زمین تک پہنچا دے۔ اگر آج تجربات آلات کے بارے میں کامیاب ہوگئے۔ تو کل حیوانوں اور پرسوں انسان کی باری آجائے گی۔

یہ سمجھنا حماقت ہے کہ یہ ایسی کل ہے جو کبھی نہیں اٹکتی۔ انسان کو جو ذہن رسا دیا گیا ہے اور جو صلاحیتیں اسے ودیعت کی گئی ہیں ان کی بدولت کل کل نہیں رہتی۔ بالآخر وہ آپ کھنچی پر راکٹوں میں رکھے ہوئے آلات نے اب ہمیں اس امر سے باخبر کردیا ہے کہ خلا کے کس حصہ میں صورت حال کیا ہے اور اس کا حیوانی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ جب حیوانات کو خلا میں بھیجا جانے لگا۔ تو آلات سے ہمیں یہ معلوم ہونے لگا کہ وہاں پر ان کا طرز عمل کیسا رہا۔ ان کے جسم پر کس قسم کے اثرات پیدا ہوئے ان کا درجہ حرارت کتنا رہا۔ ان کے حسی آلات کس حد تک متاثر ہوئے ان کی ظاہری شکل وصورت میں کیا کیا تغیرات رونما ہوئے۔ کیا انہوں نے نئے ماحول میں کوئی چیخ و پکار کی۔ اگر انہوں نے کوئی آواز نکالی تو وہ کس قسم کی تھی۔ کیا اس میں خوف گھبراہٹ اور بے چینی کے آثار پائے جاتے تھے۔ ان کے خون کے دباؤ کی کیا نوعیت تھی۔ ان کے دل کی حرکت تیز تھی یا سست، اس میں یکسانیت اور باقاعدگی تھی یا اتار چڑھاؤ کی کیفیت۔ اگر ایسا ہوا ہے تو اس کا اصل سبب کیا تھا۔ کیا اس کے دل پر کوئی بوجھ پڑا ہے اور اگر پڑا ہے تو کس سمت سے۔ اس تبدیلی کے وقت خلائی سواری کس سمت میں اور کس رفتار سے حرکت کر رہی تھی۔

یہ امر بھی انتہائی ضروری ہے کہ یہ سب معلومات اس رنگ میں حاصل ہونی چاہئیں کہ ذہنی یا جسمانی طور پر حیوانی مسافر کو

ذرا بھی تکلیف نہ ہو۔ آلات ایسے ہونے چاہئیں جو اس کی کھال کے اندر نہ داخل کئے گئے ہوں بلکہ باہری ہوں۔ پھر وہ ایسے ہوں کہ ایک ایک منٹ میں کئی کئی بار اطلاعات فراہم کر سکیں اور وہ بھی خود بخود اور پوری صحت کے ساتھ۔

ان تجربات کے دوران میں ضرورت محسوس ہوتی نئے اور خاص قسم کے نازک آلات تیار کریں۔ مثلاً اگر چوہوں پر تجربہ کرنا مقصود ہو تو یہ دیکھئے کہ کیا چوہے ان تاروں کو جن سے ان کے دل کی دھڑکنیں ریکارڈ کرنا مطلوب ہیں کاٹتے تو نہیں اگر وہ کاٹتے ہیں تو انہیں نرم ڈوریوں سے باندھ دینا مناسب ہوگا بعض اقسام چوہوں کی ایسی ہوتی ہیں کہ اگر انہیں باندھ دیا جائے تو وہ جلد مر جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس قسم کے ریڈیو بنانے پڑیں گے۔ جو ان کے جسم کے ساتھ لگے ہونے کے باوجود حرکت میں مزاحم نہ ہوں۔ وہ اتنے چھوٹے اور اتنے ہلکے ہوں کہ چوہا بغیر تکان محسوس کئے انہیں اٹھائے رکھے۔ لیکن باایں ہمہ وہ اس قدر طاقتور ہوں کہ وہ چوہے کے دل کی دھڑکنوں کو زمین تک ارسال کر سکیں۔

جب کسی چوہے یا دوسرے حیوان کو خلائی حجرہ میں رکھا گیا ہو تو یہ دریافت کرنا ضروری ہوگا کہ حجرہ کا درجہ حرارت کتنا ہے۔ اس میں آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار کتنی ہے۔ اور کس رفتار سے چل رہی ہے۔ ہوا کا دباؤ کتنا ہے۔ درجہ حرارت قابل برداشت اور قابل افزائش ہے یا نہیں اور آبی بخارات کی مقدار کس قدر ہے اور ان تمام امور کے لئے ایسے آلات کی ضرورت ہے۔ جو کافی حساس ہونے کے ساتھ صحیح اور قابل اعتماد اطلاعات فراہم کر کے فقط یہ ریکارڈ ہوتی جائیں۔ اور حجرہ کے اندر رکھے ہوئے ٹرانسمیٹر انہیں زمین تک پہنچا دیں۔

پھر اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ ایسے تجربات صرف چوہوں پر نہ ہوں بلکہ مختلف قسم کے جانوروں پر کئے جائیں تاکہ جس خصوصیت یا خاص امر کا مطالعہ کرنا مقصود ہے اس کے بارے میں مکمل اور قابل اعتماد اطلاعات مل سکیں۔

انہی خطوط پر تجربات کا آغاز ہوا۔ ابتداً چوہوں پر تجربے کئے گئے۔ پھر بلیوں اور کتوں کو استعمال کیا گیا۔ جب اس میں کامیابی ہو گئی اور انہیں سلامتی کے ساتھ واپس لانے کی تکنیک پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ تو آخری تجربہ بندروں پر کیا گیا۔ یہ بندر ۱ لاکھ ۲۶ ہزار فٹ (تقریباً ۲۴ میل) کی بلندی تک پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ چوہے بھی رکھ دیئے جاتے تھے۔ جب یہ تجربہ کامیاب رہا تو اتنے جانوروں کو اکٹھا بھیجا گیا۔ جن کا مجموعی وزن انسان کے وزن کے برابر تھا۔ وہ ۲۰۰ میل کی بلندی تک گئے۔ جب یہ قافلہ بھی سلامتی کے ساتھ واپس آ گیا تو اس امر کا علم اور اطمینان ہو گیا۔ کہ حجرہ میں جو انتظام درجہ حرارت کو برقرار رکھنے اور ہوا کو صاف رکھنے کے لئے کیا گیا تھا۔ وہ درست اور تسلی بخش تھا اور انسان پر بھی اس کا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔

اب انسان کی باری بھی آ گئی۔ پلاسٹک کا ایک غبارہ تیار کیا گیا جس میں ۲ لاکھ مکعب فٹ جگہ تھی۔ اس غبارہ کو ہیلیم سے بھر کر اوپر چھوڑا گیا۔ اور ایک باہمت انسان نے ہوابند حجرہ میں بیٹھ کر متواتر ۳۲ گھنٹے تک پرواز کی۔ اس کے جسم کے ساتھ بھی اسی طرح آلات لگے تھے جس طرح اس سے قبل چوہوں یا بندروں کے ساتھ لگائے جاتے تھے۔ یہ تجربہ صرف آلات کی فراہم کردہ اطلاعات تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ ڈاکٹروں اور سائنسدانوں کا ایک بورڈ مقرر کیا گیا جنہوں

سے نیچے بیٹھے ہوئے ہی ریڈیو کے ذریعہ مختلف سوالات دریافت کرنے شروع کر دیئے ان کی توجہ نہ صرف جوابات پر مرکوز رہی بلکہ وہ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے کہ جوابات کیسے دیئے جا رہے ہیں بورڈ کے ممبروں نے اپنی اپنی دلچسپی کے مطابق سوالات دریافت کئے اور ان کے جواب حاصل ہوتے۔ یہ تجربہ چونکہ انسان پر ہو رہا تھا۔ اس لئے اب اطلاعات زیادہ مکمل اور زیادہ قابلِ اعتماد تھیں۔ سوالات کچھ اس قسم کے تھے۔ تم کتنی دور تک دیکھ سکتے ہو؟ آسمان کتنا تاریک یا روشن ہے؟ ہوا کیسی ہے اوپر کی ہوا میں انعطاف نور کی کیا صورت ہے؟ بحیثیت مجموعی تمہارا احساس کس قسم کا ہے؟ کیا تم اس سے زیادہ دیکھتے اور محسوس کرتے ہو جتنا کہ آلات دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

خلائی وحشت کیوں کے باوجود انسان کے سر پر یہ جنون سوار ہے کہ وہ خلائی سفر کرے گا۔ ستاروں کی گردش، دکم از کم چاند تک ضرور پہنچے گا اور سلامتی کے ساتھ واپس آ جائے گا۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے اپنی عقل خداداد سے کام لے کر یہ راہ اختیار کی ہے کہ وہ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا ہے۔ پہلے اس نے آلات بردار راکٹ اور غبارے چھوڑے۔ اس کے بعد جانوروں پر تجربات کئے۔ اور اب وہ خود تختۂ مشق بن رہا ہے۔ وہ قریبی خلا میں جا چکا ہے۔ اور چار دن اور چار راتیں وہاں رہ کر سلامتی کے ساتھ واپس آ گیا ہے۔ ہر قدم نے اس کے علم اور تجربے میں اضافہ کیا ہے اور اسے آگے بڑھنے میں مدد دی ہے۔ اس کی قریبی منزل چاند ہے۔ لیکن وہاں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اسے ابھی بہت سے مدارج طے کرنا ہیں۔

مستقبل میں اس کی کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہیں یا نہیں۔ یہ تو وقت ہی بتلائے گا۔ لیکن اس وقت جو کامیابی ہو چکی ہے۔ اس سے قرآن کریم کی یہ صداقت واضح ہو جاتی ہے کہ خدا تعالےٰ نے انسان کو احسن تقویم پر پیدا کیا ہے اور نہایت اعلےٰ درجہ کے قویٰ اور نہایت اعلےٰ صلاحیتوں کے ساتھ مشرف کیا ہے۔ کاش انسان کامیابیوں اور نئی معلومات کو نسل انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرے اور خود غرضی اور طاقت کا گھمنڈ اسے جادۂ مستقیم سے منحرف نہ کر دے۔ اور فرعونیت کا بھوت اس کے سر پر سوار نہ ہو جائے ۔۔۔۔۔ اس تمام ۔۔۔ تحقیق و تفتیش کے دوران اس نے ضرور دیکھ لیا ہوگا کہ قدرت کے قوانین ہر جگہ کارفرما ہیں اور خلائی وسعتوں میں بھی نظم و ضبط پایا جاتا ہے۔ جس سے کسی طرح مفر نہیں۔ کاش اسے اب بھی یہ سمجھ آ جائے کہ ایک قادر اور بالا ارادہ ہستی اس نظام کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اور اس کی اطاعت کا جُوا اٹھانے سے کسی کو مفر نہیں وہی ہمارا مقصود اور مسجود ہونا چاہیئے۔ انجامکار راحت اور سکون اسی کی اطاعت اور فرمانبرداری میں ہے ؛

بقیہ صفحہ ۱۵

۔۔۔ ابھی تیری "انقلاب زا" دعاؤں کے محتاج ہیں"۔

محمود: اے رب مجھ کو ایک حسین خواب تصور کر رہا تھا۔ وہ اپنے سامنے تین سال قبل کا "خوابی نظارہ" دیکھ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی، شلوار اور اس پر سفید قمیص نہیں نہیں یہ کوئی خوابی نظارہ نہ تھا یہ وہ حقیقت تھی جو محمود کی اپنی ہی دعاؤں کا نتیجہ تھی ؛ (۲۷ اگست ۱۹۶۳ء)

محمد علی اولڈ بوائے

احساسِ کمتری

احساسِ کمتری عدمِ خود اعتمادی کا دوسرا نام ہے۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ احساسِ کمتری رکھنے والا فرد ہر گام پر اپنے آپ کو کمتر محسوس کرے یعنی زندگی کے طور طریقوں اور رسم و رواج سے فائق ہونے ماحول میں جانے سے گھبرائے۔ ہر وقت دوسروں سے پیچھے پیچھے رہے اور گوشۂ تنہائی میں رہنا پسند کرے۔ جب بھی وہ کوئی کام کرنے لگے تو دل میں احساس ہو کہ وہ غلط کرے گا اور دوسرے اس کو حقارت کی نظر سے دیکھیں گے وغیرہ۔

دوسری صورت یہ ہے کہ (الف) اس احساس کو دور کرنے کی کوشش کرنا اور کامیابی حاصل کرنا (ب) اس جدوجہد میں ناکام رہنا اور اس کے بعد ایسا رویہ اختیار کرنا کہ اسے احساسِ کمتری نہیں ہے بلکہ دوسرے لوگوں سے وہ بہتر آدمی ہے۔ ایسا شخص غیر ارادی طور پر اپنے آپ کو کمتر خیال کرتا ہے لیکن ارادی طور پر یہ واضح کرتا ہے کہ وہ کمتر نہیں ہے۔

کوشش کے ناکام یا کامیاب رہنے کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اور سوسائٹی نے مان لیا کہ واقعی اس شخص کی وہ خامیاں دور ہو چکی ہیں۔ تو اس کوشش کو کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ ایسے شخص میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے کوشش کے ناکام رہنے سے مراد یہ ہے کہ سماج نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ فلاں شخص نے اپنی خامیوں سے کنارہ کشی کر لی ہے۔ یا ایسی کوئی خوبی یا وصف پیدا کر لیا ہے کہ اس کی خامیاں چھپ جائیں۔ ایسے شخص کا عموماً مذاق اڑتا ہے۔ اس نوع کی سعی کو ناکام پاتے ہوئے ایسا شخص ردِ عمل کا آغاز کرتا ہے وہ اپنی حرکات و سکنات سے یہ ثابت کرنے کا اہتمام کرتا ہے کہ وہ دوسروں سے ارفع ہے۔ پُر تکلف لباس، خاص اندازِ تقریر "پدرم سلطان بود" کے مطابق اپنی اور اپنے آباؤ اجداد اور اپنے دوستوں کی لیاقت، اہلیت اور عمارت کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ اس قسم کے ہزاروں حربے استعمال کئے جاتے ہیں تاکہ ثابت ہو کہ وہ کوئی ادنیٰ شخص نہیں۔ "میرا فلاں ہم جماعت ڈپٹی کمشنر ہے۔" "میرے چار دوست لندن میں زیرِ تعلیم ہیں۔" "میں اتفاق سے ایسا ہوں میرا باپ بیس دیہات کا مالک تھا۔" "میں شلوار قمیص نہیں پہنا کرتا۔" "میرے چار گرم سوٹ اور چار سرد سوٹ ہیں۔" "میں اچار کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ روزانہ گوشت کھاتا ہوں" وغیرہ۔

بچوں کا استاد یا والدین کی موجودگی میں اپنے آپ کو کمتر سمجھنا ایک قدرتی بات ہے۔ احساسِ کمتری مرض کی صورت اس وقت دھارتا ہے۔ جب ایک شخص دائمی طور پر اپنے آپ کو کمتر سمجھنے لگے اور اس جذبہ یا احساس کی وجہ سے دوسروں سے الگ تھلگ رہے۔ یا ثابت کرنا چاہے کہ

وہ دوسروں سے گھٹیا نہیں۔ احساس کمتری کے شکار کو ہر لمحہ یہ فکر دامنگیر رہتی ہے کہ وہ دوسروں سے یہ چیز منوائے کہ وہ کسی سے کمتر نہیں۔ اس مرض کا مریض ہمہ وقت اس فکر میں رہتا ہے کہ لوگ اسے کیا سمجھتے ہیں۔ احساس کمتری کا مریض ہر معمولی بات کو بھی اپنی تحقیر سمجھتا ہے اور لوگوں سے دست و گریباں ہوتا نظر آتا ہے۔ ہمارے پاکستان کے ایک شہر میں ایک دفعہ کسی شخص کو دوسرے شخص کے بعد چائے ملی تو اس نے اس کو اپنی ہتک خیال کرتے ہوئے فوراً چائے لانے والے بیرے کو کہا۔

"تم مجھے کیا خیال کرتے ہو مجھے سب سے آخر
میں چائے پیش کرنے کی کیا وجہ؟"

دراصل وہ اپنے اس احساس کو مٹا رہا تھا کہ وہ کسی سے کم ہے۔ احساس کمتری کا مریض چھوٹی چھوٹی باتوں میں ٹانگ اڑا کر اپنی برتری منوانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے معاملات میں ہر وقت دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ اسے ہر وقت اس چیز کا خیال ہوتا ہے کہ دوسرے اس کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں۔ وہ جو بھی کرتا ہے دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے کرتا ہے۔

نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے احساس کمتری معاشرتی زندگی پر بہت برے اثرات ڈالتا ہے۔ کیونکہ ایسے ماحول میں زندگی کا کوئی کام نہ چل سکے گا۔ ایک شخص کو افسر بھی بننا پڑے گا اور بعض اوقات ماتحت بھی۔ اس لئے احساس کمتری کا مریض ہر کام پر ناکام رہے گا۔ جب اسے ہر وقت یہی فکر رہے گی کہ اگر اس نے فلاں کام کیا تو دوسرے اسے کیا سمجھیں گے وہ کوئی کام بھی بخوبی نہ کر سکے گا۔ پس ہمارا اس مرض سے بچنا ازبس ضروری ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳)

رکھتا تھا کہ وہ اپنے مضمون پر پوری طرح حاوی ہو، وہ جس علم کی تحصیل کا بھی ارادہ کرے اسے کمال تک پہنچا دے مختصراً وہ اپنے علم و فن کا شہسوار ہو۔ اسے نیاز کے اس طرح روپوش ہو جانے پر بہت دکھ ہوا۔ وہ اکثر اس کی شومئ قسمت پر خون کے آنسو بہاتا رہتا۔

رہائی کے پانچویں دن جبکہ یونیورسٹی کے تمام طلباء ایک ٹرپ پر گئے ہوئے تھے۔ اور محمود ناسازئ طبع کے باعث ہوسٹل میں ہی تھا۔ نیاز اچانک یونیورسٹی کی حدود میں نمودار ہوا۔ وہ تیز قدم رکھتے ہوئے محمود کے کمرہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دارالاقامہ کے ملازمین اسکو بالکل نہ پہچان سکے۔ مشرقی لباس میں ملبوس وہ کوئی اور ہی انسان نظر آ رہا تھا۔ گذشتہ سات دن کے اندر اندر اس کے افکار و خیالات میں ایک زبردست انقلاب رونما ہو چکا تھا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ وہ اپنے نہایت ہی ہمدرد دوست سے ملنے کے لئے ہر آن بےتاب تھا۔ اپنے کردار میں تبدیلی کئے بغیر محمود سے ملنا اس کے نزدیک حد درجہ کی ناپاسی تھی۔ اب تو اسے محمود کی معمولی سے معمولی خواہش کا بھی احترام تھا۔ دور سے ہی جب محمود کے کراہنے کی آواز سنی۔ تو وہ زیر لب ولولہ انگیز انداز میں یہ شعر گنگنانے لگا۔

ہوتا ہے آج فیصلہ امید و یاس کا
سنتا ہے لو وہ دل کر لیا اور آ گیا

جونہی نیاز کمرہ میں داخل ہوا اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "محمود! غم خوار ملت محمود! خاطر جمع رکھو۔ تمہارے درد کا علاج حاضر ہے۔ اب تم بہت جلد شفا پا جاؤ گے۔ خدا کا رحم محمود! خدا تمہارا نگہبان! رب العزت تمہارا حامی و مددگار! قوم کو بھی تمہاری قیمتی جان کی بہت ضرورت ہے۔ مجھ جیسے کج مزاج

(باقی دیکھیں صفحہ ۳۰)

چوہدری محمد نواز
ایف اے سال دوم

دُنیا کا سب سے بڑا جرنیل

آج قومی عصبیت کا دور دورہ ہے۔ دنیا کی ہر قوم اور ہر ملک کے تاریخ نویس اس بات پر زیادہ سے زیادہ زور صرف کرتے ہیں کہ ان کے ہیرو کو دنیا کا سب سے بڑا انسان تسلیم کیا جائے۔ تاریخوں میں ایسے بے شمار نام ملیں گے جن کے ساتھ "فاتح اعظم" "عظیم سپاہی" "دنیا کا سب سے بڑا جرنیل" وغیرہ القاب لکھے ہوئے ہوں گے۔ لیکن اگر کوئی مورخوں کے عطا کردہ ان اعزازات کو دلیل اور انصاف کے ترازو میں تولنے لگے تو مایوسی اور افسوس کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئیگا۔ تحقیق کرنے والا دیکھے گا کہ محض قوم پرستی کے جوش میں بعض ایسے لوگوں کو بھی ان اعزازات سے نواز دیا گیا۔ جن کے قابلِ نفرت کارنامے اجازت نہیں دیتے کہ انہیں تاریخ کے صفحات میں ادنےٰ سا مقام بھی دیا جائے۔ لیکن حضرت خالد بن ولید کے حالات پڑھنے والا ہر انصاف پسند اور صاف ذہن رکھنے والا انسان محسوس کرسکتا ہے کہ اسلام کے اس عظیم الشان فرزند کے نام کے ساتھ "دنیا کا سب سے بڑا جرنیل" لکھنا ایک بہت ادنیٰ درجہ کا خطاب ہے۔ ان کے محیر العقول کارنامے دلیل بن کر قدم قدم پر مطالبہ کرتے ہیں کہ فرزندِ اسلام کو تمام دنیا کی تاریخ میں انہیں وہ مقام دیا جانا چاہیئے جس کا مستحق دنیا کے کسی فاتح، کسی جرنیل اور کسی سپاہی کو نہیں سمجھا گیا

یقیناً دوسری قوموں اور ملکوں کی تاریخوں میں بھی ایسے لوگوں کے تذکرے ملیں گے۔ جنہوں نے اپنی تلوار اور تدبیر کے بل بوتے پر زمانے سے اپنا لوہا منوایا۔ جنہوں نے بڑے بڑے معرکے سر کرکے قوموں کی قسمتیں اور دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ لیکن اپنی پوری زندگیوں میں انہوں نے کتنی بار یہ کارنامے انجام دیئے۔ جن قوموں اور ملکوں کو انہوں نے شکستیں دیں۔ ان کی حربی قوتیں کیا تھیں؟

اگر ان سوالوں پر غور کیا جائے۔ تو دنیا کے اور فاتحین کو حضرت خالد بن ولید کے مقابلہ میں نہیں لایا جاسکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہمیشہ قوت کے نشہ میں سرشار ہوکر طاقتور قوموں نے اپنی کمزور ہمسایہ قوموں پر یلغار کی اور شہنشاہوں کے تنخواہ دار فوجوں نے ظلم و زیادتی کی۔ ان داستانوں کو شجاعت اور قربانی کا ملمع چڑھا کر تاریخ کے اوراق کی زینت بنادیا۔

جولیس، سکندر، نپولین اور دنیا کے دوسرے فاتحین کی داستانوں کا تجزیہ کرنے کے بعد صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ طاقت نے کمزوری کو، کثرت نے قلت کو اور ظالم نے مظلوموں کو فتح کیا۔

ان فاتحین کی داستانوں میں حضرت خالد بن ولید کی فتوحات ایک رنگ۔ کہاں کہ ہمیشہ مظلوموں نے ظلم کے گریبان کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ قلت نے کثرت کو چیلنج کیا ہو۔ یا پیادہ غازیوں نے آہن پوش سواروں کو نیچا دکھایا ہو۔

دنیا کے دوسرے فاتحین کی داستانوں میں ایسے کتنے بندہ

مکوڑے کہاں کہ جنگ یرموک میں دشمن کی دو لاکھ سے زیادہ فوج کے مقابلہ میں صرف ۲۰-۳۰ ہزار مجاہد لیکر نکلتے ہیں اور اس شان کے ساتھ فتح حاصل کرتے ہیں کہ دشمن کو پیٹھ پھیر کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ جنگ موتہ میں ایک لاکھ لشکر کے مقابل پر صرف تین ہزار مسلمان جانباز تھے۔ جب آپ ایسے وقت میں فوج کی کمان سنبھالتے ہیں جبکہ تین جلیل القدر سپہ سالار جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک مسلمان بھی زندہ بچ کر نہیں جائے گا۔ لیکن حضرت خالد بن ولید کی بے مثل شجاعت اور کمال فراست و خوش تدبیری نے باقی ماندہ مسلمانوں کو دشمنوں کی فوج کے نرغہ سے نکال دیا۔

اپنے وطن سے منزلوں دور، پرائے ملک میں آکر ایسے بے سروسامان لشکر کا رومیوں اور ایرانیوں کے عظیم الشان لشکروں کو شکست دینا معجزے سے کم نہیں۔ حضرت خالد نے عراق اور شام میں جتنی لڑائیاں لڑیں ان تمام میں کوئی جنگ ایسی نہیں جس میں مسلمانوں کی تعداد دشمن کی تعداد کے نصف کے بھی برابر ہو۔ لیکن ہر معرکہ میں مظفر و منصور رہے اور ہر لڑائی میں دشمن کو نیچا دکھایا۔

یہ ایسی باتیں ہیں جو کسی قوم کے ہیرو اور دنیا کے کسی بھی جرنیل کی زندگی میں نہیں ملتیں۔ انسانیت کی پوری تاریخ میں صرف حضرت خالد بن ولید ہی ایسے جرنیل ہیں۔ جنہوں نے دشمن کی کثرتِ تعداد اور سامانِ حرب کی فراوانی کے باوجود تمام بڑی لڑائیاں حسن تدبیر اور شجاعت کے بل بوتے پر فتح کیں۔

اپنے عہد کا پاس، پاکبازی، فرض شناسی اپنی جان کے مقابلے میں اپنے مشن سے محبت، ناقابل شکست اعتماد اور بے نظیر شجاعت، یہ تمام خوبیاں حضرت خالد کے کردار میں بدرجہ اتم نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنے مقصد کے مقابلے میں اپنی زندگی کو کبھی عزیز نہیں رکھا۔ دوسرے جرنیلوں کی طرح قلب لشکر میں محفوظ مقام پر رہ کر احکام صادر کرنے کی بجائے وہ ہمیشہ پہلی صف میں رہ کر دشمن سے دست بدست جنگ کرتے تھے انہیں اسلام کی صداقت اور اپنی مہم کی کامیابی کا اس طرح یقین تھا جس طرح ہر روز سورج نکلنے کا۔ وہ قبل از وقت دشمن کی جنگی چالوں کو سمجھنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ان کی زیادہ سے زیادہ کوشش ہوتی تھی کہ کم سے کم جانی نقصان سے فتح حاصل ہو۔ بے غرضی اور اولی الامر کے ساتھ وفاداری کا یہ عالم تھا کہ اپنی معزولی کی خبر سنکر پیشانی پر بل تک نہیں آیا۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے آج تک مخالفین بھی یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ

"خالد دنیا کا سب سے بڑا جرنیل ہے"۔

بقیہ تعلیم الاسلام انٹرمیڈیٹ کالج گھٹیالیاں

اس کے ذریعہ حقیقی اسلام کی اشاعت کی غرض بھی پوری ہو اور اس کے ساتھ ہی اس علاقہ کو علوم جدیدہ کی روشنی سے منور کیا جائے۔ قارئین کرام دعا فرمائیں کہ اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے ہم کو اس نہایت اہم ذمہ داری کے ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور اس کالج کو ترقی اور عروج تک پہنچنے کی سعادت مندی سے بہرہ ور فرما وے آمین

مولوی محمد عثمان صاحب ایم۔ اے

تعلیم الاسلام انٹرمیڈیٹ کالج گھٹیالیاں کے مختصر کوائف

تعلیم الاسلام کالج گھٹیالیاں کا اجرا باقاعدہ طور پر یکم ستمبر ۱۹۶۱ء سے ہوا۔ کالج ہذا پر اگرچہ اب تک ایک سال ہی گذرا ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ دن بدن ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔ اب تک سیکنڈری بورڈ کی طرف سے کالج کا معائنہ دو دفعہ ہو چکا ہے اور دونوں مرتبہ ہی معائنہ نہایت کامیاب رہا ہے۔ اس وقت کالج میں نہم دسویں گیارہویں اور بارہویں چار جماعتیں ہیں۔ کلاس نہم اور دہم میں داخلہ کی رفتار بہت خوشکن ہے۔ سٹاف تقریباً سات ممبران پر مشتمل ہے جو انگریزی، تاریخ، فارسی، عربی، اردو، اسلامیات اور فلسفہ وغیرہ پڑھاتے ہیں۔ کالج ہذا کی باقاعدہ سٹوڈنٹ یونین بھی بنی ہوئی ہے۔ یونین تقریباً ہر جمعرات کو اپنے علمی اجلاس منعقد کرتی ہے جس میں تمام طلباء شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ کھیلوں کے لحاظ سے فٹ بال، والی بال اور بیڈمنٹن کی ٹیمیں بنی ہوئی ہیں اور کالج کے وسیع میدان میں شام کو مختلف کھیلیں ہوتی ہیں۔

کالجوں میں لائبریری ایک نہایت ضروری چیز ہے چنانچہ اس کالج میں لائبریری اور ساتھ ہی ریڈنگ روم بھی ہے جہاں مختلف اخبارات اور اردو انگریزی رسائل پڑھنے کا معقول انتظام ہے۔ طلبہ فارغ وقت میں یہاں بیٹھ کر افادہ کرتے ہیں۔ لائبریری بالکل جدید اور نہایت مفید کتابوں پر مشتمل ہے۔ کالج کی عمارت پختہ ہے۔ اور ہال کے علاوہ آٹھ کھلے کمروں پر مشتمل ہے اور عمارت سے ملحق چھوٹا سا پارک ہے۔ جس میں عمدہ روشیں بنی ہوئی ہیں۔ ایک غیر مسقف مسجد بھی ہے اور اب عرصہ چار ماہ سے ڈاکخانہ بھی قائم ہے۔

کالج کی عمارت بروالیو ریلوے سٹیشن سے آٹھ میل اور کلاسوالہ سے بھی تقریباً اتنے ہی فاصلہ پر واقع ہے اور ایسی پرفضا جگہ میں ہے جو کالج کے لئے نہایت موزوں ہے۔ یعنی شہری ہنگامہ سے بالکل الگ تھلگ پرسکون اور سادہ ماحول کالج کی جاذبیت اور اہمیت میں اور بھی اضافہ کرتا ہے۔

یہ مختصر سے کوائف اس تعلیمی ادارہ کے ہیں جو ضلع سیالکوٹ میں اس غرض سے جاری کیا گیا ہے۔ تاکہ

(باقی ۲۱ پر)

افسانہ

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو اے دل
گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے

چوہدری رشید احمد جاوید بی۔ اے تھرڈ ایئر

ذہانت و فطانت بلا کی۔ محمود ذکاء غیر معمولی فطرت کا درجہ سلیم، واللہ تعالیٰ کا محمود پر بڑا احسان تھا۔ وہ بھی اللہ کی انعامات اور احسانات سے بے خبر نہ تھا۔ اس کا دل مروت خداداد، نعمتوں کے شکر سے معمور رہتا۔ خلق، نہ سے اسے بہت ہی پیار تھا۔ قوم و ملت کی محبت گویا اسکی جبلت میں شروع سے ہی ودیعت کر دی گئی تھی۔ وہ اکثر اپنے ہم نشینوں کو نصیحت کرتا رہتا کہ "ہم سب قومی ترقی اور ملی سربلندی و رفعت کی فلک بوس عمارت کے معمار ہیں۔ ہمیں اپنے اندر ملیت کا احساس اور اولوالعزمی کو جنم دینا ہے۔ اپنے اخلاق کو سنوارنا ہی نہیں بلکہ ان میں الٰہی رنگ پیدا کرنا ہے۔ ہم اپنی قوم کی اقدار اور ملکی روایات کے نگہبان ہیں۔ خدا نہ کرے ہماری نگہبانی اور فرض حفاظت میں کوئی فرق آ جائے۔ ہمارا معاشرہ ہماری محنت کا رہین منت ہے۔ اگر ہم اپنی قوتوں اور اپنے افعال سے اسکی عمارت پر گندگی اور کچی اینٹیں لگائیں اور اسکی دیواروں کو ویرانی اور مدہوشیت کے نذر کر دیا تو ہماری مستقبل کی نسلیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔"

اخلاقی انحطاط اور پست کرداری کا مظاہرہ اس کے ننھے سے حساس دل کو تیروں کی مانند چھلنی کر دیتا۔ قوم سے محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ اسے ۱۶ سال کی چھوٹی سی عمر میں اپنے شہر کی "مجلس اصلاح معاشرہ" کا باقاعدہ رکن بننا پڑا۔ وہ بہت جلد اراکین مجلس میں ہر دلعزیز ہو گیا۔ مجلس کے نئے انتخاب پر اسے اتفاق رائے سے "جنرل سیکرٹری" بنا دیا گیا۔ سن چھیاسٹھ میں اس نے ایف۔ ایس۔ سی (پری میڈیکل) کا امتحان ڈویژن بھر میں اول پوزیشن حاصل کر کے اعزاز سے پاس کر لیا۔ والدین اور بھائی بہنوں کی خوشی تو خیر ایک فطری تقاضا تھی۔ تمام اہل شہر بھی اس کی نمایاں کامیابی پر یکساں مسرور تھے۔ وہ سب محمود کے اندر ایک نمایاں شخصیت کے آثار دیکھنے لگے۔

اسی دوران حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ "ناجیبہ یونیورسٹی" (Karawaczlyi university) نے ہمارے ملک کے طلباء کو مختلف مضامین میں وظائف دینے کا اعلان کیا ہے۔ ان مضامین میں انجینئرنگ کورس بھی شامل تھا۔ شرط یہ تھی کہ امیدوار نے ایف ایس سی فرسٹ ڈویژن میں پاس کی ہو۔ محمود نے موقعہ کو غنیمت جانتے ہوئے اپنی خواہش کے لئے ایک درخواست مع دیگر کوائف کے محکمہ متعلقہ کو ارسال کر دی۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۶ء درخواست دینے کی تاریخ تھی۔ محمود ان دو خوش قسمت طلباء میں سے ایک تھا جنہیں "ناجیبہ یونیورسٹی" میں انجینئرنگ کورس کے وظائف کا مستحق قرار دیا

گئی۔ ۱۵ اکتوبر کو جب اسے اپنے انتخاب کی اطلاع ملی تو وہ خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ محمود کا انتخاب اس کے والدین کی توقعات اور خواہشات کے عین مطابق تھا۔ وہ اس سب کچھ کو خدا تعالیٰ کے فضل اور رحم سے تعبیر کرتا۔ ان ایام میں اکثر وہ نماز تہجد التزام سے ادا کرتا۔ اسے اپنے سامنے ایک روشن مستقبل نظر آ رہا تھا۔ جذبات تشکر ان کی آنکھوں میں نم کا ایک شیریں اور کیف آور سماں پیدا کر دیتے۔

اطلاع کے مطابق اسے ۳۱ اکتوبر کو وفاقی دارالحکومت پہنچنا تھا۔ تاکہ دو نومبر کو روانہ ہونے والے بحری جہاز "لب عظم" پر سوار ہو سکے۔ جہاز ہر سال مختلف غیر ملکی یونیورسٹیوں کے لئے منتخب طلباء کو لے جانے کے لئے وقف تھا۔ "بحیرہ" شہر سے وفاقی دارالحکومت تک دو دن ریل کی مسافت تھی روانگی سے ایک روز قبل "مجلس اصلاح معاشرہ" کے اراکین کی طرف سے محمود کے اعزاز میں "بحیرہ تحصیل پریوا تیج" ٹورسٹ ہوٹل" (Tourist Hotel) میں وسیع پیمانے پر ایک رنگا رنگ "الوداعی تقریب" کا انتظام کیا گیا۔ مجلس کے ممبر اور دیگر معززین شہر نے محمود کو خراج تحسین پیش کیا اور اسکی آئندہ کامیابیوں کے لئے دعا کی۔ پروگرام کے مطابق اگلے دن ۲۹ اکتوبر کو ۵ بجے اسے "فیڈرل ایکسپریس" (Federal Express) کے ذریعہ روانہ ہونا تھا

۲۹ اکتوبر کی صبح کو نماز فجر کے بعد تلاوت قرآن پاک سے فارغ ہو کر محمود نے اپنے سامان کو چیک کیا۔ تمام ضروریات سفر پا مکمل نیاز تھیں۔ محمود کے بہن بھائی حسب معمول صبح سویرے سے ہی ناشتہ کر رہے تھے۔ انہیں آج اپنے نہایت ہی ہمدرد اور عزیز بھائی کو حصول تعلیم کی غرض سے ایک دور دراز جزیرہ نیشنز (Nations Island) کے لئے رخصت کرنا تھا۔ سات بجے سے قبل ہی تمام افراد خانہ ڈرائنگ روم (Drawing Room) میں جمع ہو گئے تھے محمود ان میں بیٹھا ہوا یوں معلوم ہو رہا تھا گویا کوئی شہزادہ ہے جسے شاہی فرمان کے تحت کسی بڑی مہم پر بھیجا جا رہا ہے۔ دوران گفتگو اس نے اپنے ابا جان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"ابا جان! آج رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ میں بیمار ہوں اور ایک کمرہ میں پڑا دھیمے دھیمے کراہ رہا ہوں اچانک میری حالت بہت نازک ہو جاتی ہے اس دوران دفعتہً ایک نوجوان طبیب بہت کمرہ میں داخل ہوتا ہے اور مجھے تسلی دیتا ہے۔ اس کی آواز اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے، "محمود تیرے درد کا علاج میرے پاس ہے۔ میں نے تمہاری بیماری کی پوری تشخیص کر لی ہے، فکر نہ کرو اور خاطر جمع رکھو۔ خدا تمہارے قیمتی وجود کا نگہبان ہے تم ہمیشہ اس کی حفاظت میں رہو۔" — پھر اس نوجوان نے مجھے ایک دوائی دی جونہی میں نے اسے استعمال کیا میرے تمام جسم میں ایک دم اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ فرط مسرت سے آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ میرے منہ سے اس مسیحا انسان کے لئے بے اختیار دعائیں نکل رہی تھیں۔"

محمود کے ابا نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"محمود تم نے اس نوجوان کا نام معلوم کیا؟"

محمود نے جواب دیا۔

"یہاں آبا جان بولیں تے اس سے پوچھا "کیا میں اپنے مہربان رفیق سفر کا اسم گرامی معلوم کر سکتا ہوں؟" اس نے کہا "کیوں نہیں محمود! تم بڑے شوق سے مجھے "نیاز" کے نام سے پکار سکتے ہو۔"

ابا نے پھر پوچھا۔

"اس نوجوان کے چہرہ مہرہ کے متعلق تمہیں کچھ یاد ہو؟"

"اس کا چہرہ دیکھنے میں بہت سنجیدہ، حسین اور وجیہہ نظر آتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی اس کے چہرہ پر بہت ہی بھلی معلوم ہوتی۔ متلون مزاجی نام کو نہ تھی مجھے تو وہ کوئی فرشتہ رحمت نظر آتا تھا۔ اس کی علمی اہمیت کے قطع نظر اس کا متبسم چہرہ ہی مسیحائی رنگ رکھتا تھا۔"

ابا کے استفسار پر محمود نے اس کمرے کی وضع قطع بھی بتائی جس میں پڑاؤ گزار رہا تھا۔

"مربع نما چھوٹا سا کمرہ تھا نہایت صاف ستھرا یوں معلوم ہوتا تھا گویا مختصر سا لائبریری روم ہے۔"

ابا نے خواب سن کر محمود کو تسلی دی اور دعائیہ لہجہ میں کہا۔

"میری امیدوں کی کلی! خدا تمہیں اپنی محبت کی گرمی سے پورا اور مکمل پھول بنائے جس طرح پھول دیکھ کر دنیا خوش ہوتی ہے۔ اسی طرح تمہاری ذات سے دنیا فائدہ اٹھائے۔ تم جہاں کہیں جاؤ اپنے ماحول کو نیکنامی اور محبت کی خوشبو سے مہکا دو۔"

جب ٹرین کے آنے میں تھوڑا وقت باقی رہ گیا تو امی نے اپنے جگر گوشہ کو گلے لگایا، پیار کیا دعائیں دیں الوداع کرتے ہوئے کہا

"میرے محمود میرے لخت جگر! اب تمہیں جانا چاہیئے۔ گاڑی آنے والی ہے فی امان اللہ۔ خدا تمہاری امی کو اس عارضی جدائی کے سہارنے کی توفیق دے۔"

ابا نے گلے میں پھولوں کے ہار پہنائے ٹھیک ۹ بجے گاڑی اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ محمود کے دوستوں اور ہمدردوں نے کثیر تعداد میں اسٹیشن پر پہنچ کر محمود کو دلی دعاؤں کے ساتھ الوداع کہا۔

گاڑی محمود کو لیکر منزل مقصود کی طرف روانہ ہوگئی۔ اسکی مشتاق نگاہیں دور تک اپنے دوستوں ہمدردوں اور دیگر رشتہ داروں پر جمی رہیں۔ پانچ سال کا طویل عرصہ ٹریننگ اسے بار بار "مجیدہ" کی حسین یادوں میں محو کر دیتا۔

زمانہ جدید کا "بے جان جانور" "گدھا" اپنی پشت پر نہیں بلکہ اپنے پیٹ میں ہزاروں ہزار نفوس انسانی کو سمیٹے تیزی سے جانب غرب دوڑا جا رہا تھا۔ محمود کا دماغ "جامعہ یونیورسٹی" اور "نیشنل آئیلینڈ" کے حسین تصوراتی مناظر بنانے میں مصروف تھا اگرچہ لباس ہر دو اصطلاح عوام میں جنٹلمین نظر آرہا تھا لیکن اس کی دینداری اور حسن اخلاق نے کمرہ کے تمام مسافروں کے دل موہ لئے تھے۔ ایسا بھلا کیوں نہ ہوتا محمود کا دل اہل وطن کی محبت میں ہر وقت گداز رہتا تھا۔

دوسرے دن ۲ بجے صبح "فیڈرل ایکسپریس" طاہر آباد ٹھہری تو گاڑی کے دھچکے نے محمود کو میٹھی نیند سے بیدار کر دیا گاڑی منزل مقصود کے قریباً نصف پر کھڑی تھی۔ محمود نے ہاتھ پاؤں کھولنے کی حاجت محسوس کی سردیوں کا موسم تھا۔ کمبل اوڑھ کر پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرنے لگا۔ دس بارہ منٹ بعد جب نیا انجن لگ چکا تو سگنل (signal) نے سبز اشارہ سے "مہمان" کو رخصت ہونے کی اجازت دی ــــ محمود اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو اپنی نشست کے ساتھ ہی ایک جنٹلمین کو بیٹھا پایا عمر میں کوئی سال ڈیڑھ سال اس سے چھوٹا۔ چہرہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ سے پھول کی مانند کھلا ہوا۔ گرم لباس میں ملبوس، وضع قطع سے طالب علم کا سا ڈھنگ غالب ــــ کچھ

دیر خاموش رہنے کے بعد محمود نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا

"آپ کہاں تشریف لے جائیں گے؟"

"وفاقی دارالحکومت بھائی صاحب"

"تب تو بھئی "ہم منزل" ہوئے۔ وقت اچھا گزر جائے گا"

"آپ کا مقام روانگی؟"

"میں [illegible] سے آرہا ہوں"

"ہاں ہاں، جہاں جھیل بھی ہے۔ گزشتہ سال میں اور ابا جان وہاں سیر کے لئے گئے تھے۔ بہت ہی خوش نما جگہ ہے بھئی!"

"لو صاحب! اہم چیز تو میں بھول ہی گیا۔ آپ کا اسم شریف؟"

"نیاز ۔۔۔ اور آپ کا؟"

"آپ نیاز ٹھہرے تو ہمیں "نیاز مند" ہونا چاہیئے"

"بشرطیکہ "نیاز مند" کے معنی "محمود" ہوں"

"لیکن آپ کو میرے نام کا علم کس طرح ہوا؟"

"آپ خود ہی سوچ لیں"

"آپ نجوم اور پامسٹری کے طالب علم تو نہیں"

"نہیں ہمارے نیاز مند۔ ابھی کل تو میں نے ۔۔۔۔ ایف ایس سی (میڈیکل) ۔۔۔۔"

"او ہو گستاخی معاف۔ نام معلوم کرنے کے لئے آپ میرے بکس کے "نیاز مند" ہوئے ہیں۔ میں نے احتیاطاً اس پر اپنا نام اور پتہ لکھوایا ہوا ہے۔ کیا آپ کسی میڈیکل کالج میں داخلہ لینے جا رہے ہیں۔ اپنے شہر کے کالج میں داخل ہو جاتے!"

"بات دراصل یہ ہے۔ شاید آپ کو بھی معلوم ہو کہ گزشتہ ماہ حکومت کی طرف سے اخبارات میں یہ اطلاع شائع ہوئی تھی کہ "نائجیریا یونیورسٹی" نے ہمارے ملک کے ذہین طلباء کے لئے مختلف تعلیمی وظائف جاری کیے ہیں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سلیکشن میں میرا نام بھی آگیا میرا آج کا سفر اسی غرض سے ہے"

"آپ وہاں کس لائن میں ٹریننگ لیں گے؟"

"ایس۔ ایچ۔ ڈی"

"یعنی سپیشلسٹ اِن ہارٹ ڈزیزز"

"آپ نے بجا فرمایا"

"بہت خوب! ڈاکٹری۔ ایک معزز پیشہ ہے جس سے خدمتِ خلق ہو جاتی ہے۔ تیسرے ملک کو ہر ڈاکٹر دل کی ضرورت بھی ہے۔ اچھا تو آپ وہاں امراض قلب پر کتنا عرصہ تحقیق کریں گے؟" "تقریباً پانچ سال"

محمود ان کو الف سے اگرچہ بخوبی واقف تھا لیکن وہ اپنے عزائم کے متعلق مطلقاً خاموش رہا۔ اب اس کی تمام تر توجہ اس امر کی طرف مرکوز ہو گئی کہ یہ نیاز کہیں میرے خواب والا نیازی نہ ہو۔ میڈیکل لائن کا تصور، نیاز کے چہرہ کے بعض خدوخال اور اس پر چھپی مسکراہٹ اسے بار بار کسی کی یاد دہانی کرا رہے تھے۔ اس کے کانوں میں یہ آواز گونجنے لگی

"محمود! تمہارے درد کا علاج میرے پاس ہے ۔۔۔ فکر نہ کرو خاطر جمع رکھو کہ قوم ابھی تمہارے درد کی محتاج ہے بہت محتاج۔ خدا تمہارا نگہبان ہو محمود! تم ہمیشہ اس کی حفاظت میں رہو" نیاز کی شیریں کلامی اور ڈھارس بندھانے والے الفاظ اسے بار بار یاد آ رہے تھے۔ وہ دل ہی دل میں کہتا۔ وہ دل کیسا مشفق تھا جس کی گہرائیوں سے یہ الفاظ نکلے وہ آواز کتنی پیاری، کس قدر دلکش اور پُراثر تھی جس نے میرے ہوش و حواس کی فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اے کاش کوئی ٹیپ ریکارڈر ان الفاظ کو محفوظ

کرسکتا۔ جب وہ دل ہی دل میں یہ سب کچھ کہہ چکتا تو ساتھ بیٹھے ہوئے نیاز کا تجزیہ کرنے لگتا۔

"اس کا لباس بالکل ٹیڈیوں والا ہے میرے مشفق نیاز کا لباس بہت شریفانہ تھا۔ یہ نیاز تو سر سے لے کر پاؤں تک تمہارے اُس نیاز کا بالکل الٹ ہے۔ چند مشابہتیں ضرور ہیں۔ لیکن اس قدر تطابق تو عام ہے۔ کئی نیاز ہو چکے بہت ہیں اور نہ جانے کتنے اور ہوں گے۔ کوئی ضروری ہے کہ یہی وہ نیاز ہو۔ خواب بہرحال خواب ہی ہوتا ہے"! یہ کہہ کر وہ اپنے دل کو مضبوطی سے اس بات پر جما لیتا کہ یہ نیاز ہرگز وہ نیاز نہیں۔

مگر چونکہ محمود نے بہت حساس طبیعت پائی تھی، اس لئے نیاز کے رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر وہ بہت آزردہ ہوا۔ اس نے اپنے دل میں پختہ عہد کر لیا کہ وہ ضرور اس نیاز کی اصلاح کرے گا۔ آخر پانچ سال تک انہوں نے ایک ہی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی ہے۔ "کچھ نہ کچھ سینک تو اسے ہماری آگ کا لگے گا ہی!!" اگرچہ محمود نے دوران سفر بھانپ لیا تھا کہ نیاز کی طبیعت میں ضد اور ہٹ دھرمی کا مادہ بہت پایا جاتا ہے۔ تاہم وہ اس یقین سے پُر تھا کہ وہ اس کے اندر قومی درد اور ملی ہمدردی پیدا کر کے چھوڑے گا۔ جس طرح بھی بن پڑا وہ اسے مغربیت کے زہر سے بچائے گا۔ ابتدائی مراحل میں مرض سہل العلاج ہوتا ہے اور یہ امر خوش آئند تھا کہ نیاز کے اندر ابھی مغربیت کے جراثیم ابھی نئے نئے تھے۔ وہ دل ہی دل میں کہتا کہ "نیاز! تمہارے مرض کی دوا میں ہوں۔ میں تمہیں "اپنے عمل" کی دوا پلاؤں گا پھر دیکھنا کہ تمہارا ذہن بہت جلد حبِ وطن اور حبِ ملت

کے جذبے سے سرشار ہو جائے گا۔ پھر وہ قدرے جوش سے کہتا "تمہارے ذہنی جمود کو جھنجھوڑا جائے گا۔ ضروری ہے کہ تم احساس کمتری کی نیند سے جاگو۔ تمہارے اندر صحت مند بیداری کا بیج بویا جائے گا۔ جلد ہی تم اپنے اندر یہ انقلاب دیکھ لو گے"۔ پھر اس کا دل قدرے نرم پڑ جاتا اور وہ دردمند لہجے میں یہ دعائیہ کلمات کہتا "خدا تمہیں قوم کے لئے ایک مفید وجود بنائے۔ خدا تجھے قوم کی ترقی و سربلندی میں حصہ لینے کے شرف سے نوازے۔ وہ تمہارے مغربیت کے زنگ میں آلودہ دماغ کو بسرعت تمام جلا اور روشنی بخشے"

غرضیکہ ہم وطنی کا معاملہ تھا۔ محمود و نیاز باہم کافی مانوس ہو گئے تھے۔ دوران سفر کھانے پینے اور مٹھائی وغیرہ کے دور اکٹھے چلتے رہے۔ ۴½ بجے شام جب وہ وفاقی دارالحکومت پہنچے تو گہرے دوست بن چکے تھے۔ نیاز باصرار محمود کو شہر میں واقع اپنے چچا کے ہوٹل پر لے گیا۔ سہ منزلہ "گرین ہوٹل" کی عالی شان عمارت اور اس کی مختلف النوع روشنیاں ہر کسی کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ نیاز نے فوراً تیسری منزل پر ایک کمرہ خالی کر دیا۔ سامان وغیرہ نیچے سٹور میں رکھوا دیا۔ کھانا حاضر کیا گیا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو نیاز نے محمود کا انٹرویو لینا شروع کر دیا۔

"محمود بھائی! میں تو کل ساڑھے دس بجے "طالب علم" کے ذریعہ "چشتیز آئی لمیٹڈ" روانہ ہو رہا ہوں۔ بہت افسوس ہے ملاقات مختصر رہی۔ اگر آپ "مقصدِ منزل" سے آگاہ فرما دیں تو ممنون ہوں گا۔ آپ کی اعانت میرے لئے ضرور باعث سعادت!! مجھے بہت حسرت رہے گی اگر میں آپ کی کوئی خدمت نہ کر پاؤں۔

— گھر پہنچیں تو — خیریت سے ضرور مطلع فرمائیں۔ ایڈریس حاضر ہے"

"آپ نے تو نیاز صاحب، ایک ہی سانس میں کئی باتیں کہہ ڈالیں۔ اگر عکس پڑھی ہوتی تو بچت وقت کا احساس ہوتا۔ اگر آپ صرف اسی پر اکتفا کرتے کہ میرے یہاں آنے سے کیا غرض ہے تو بس مقصد حل تھا بر حال مضی ما مضی۔ مختصراً عرض کئے دیتا ہوں کہ جو منزل مقصود آپکی ہے میری" ....

"واللہ تو کیا واقعی ہماری منزل ایک ہے۔"

"اپنے بھائی کی زبان پر اعتبار کیجئے"

"فالحمد للہ ثم الحمد للہ مگر بڑی دیر بعد لب کشائی ہوئی"

* * *

اگلی صبح دونوں دوست جب بازار سے شاپنگ (shopping) وغیرہ کے بعد واپس ہوئے تو "طالب علم" کی روانگی میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا۔ ۱۸۸ نمبر بس ہوٹل کے سامنے بندرگاہ کے لئے تیار کھڑی تھی۔ ۱۵ منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد دونوں دوست سمندر کنارے چیکنگ پوسٹ (checking post) پر کھڑے تھے۔ چیکنگ ہوئی تو انہیں جہاز پر سوار ہونے کی اجازت ملی۔ "طالب علم" برطانوی ساخت کا بہترین بحری جہاز تھا سو کمروں کی وسعت کا یہ جہاز چھوٹا سا ہوٹل معلوم ہوتا تھا عین ساڑھے دس بجے جہاز "جزیرہ نیشنیز" کی جانب روانہ ہوا۔ نیاز کے چچا نے بندرگاہ پہ دونوں دوستوں کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔ جہاز بہت تیز چل رہا تھا۔ جب کبھی کوئی بندرگاہ آتی - ایندھن لیتا، بعض جگہوں پہ طالب علموں کو بھی اتارتا اور آگے روانہ ہو جاتا۔

مسلسل ایک دن اور ایک رات چلنے کے بعد جہاز "بحیرہ علوم" (The Sea of Sciences) میں داخل ہوا۔ جزیرہ نیشنیز کی بندرگاہ سائنسول (science ville) پر بڑا سا مختلف الالوان جھنڈا ہوا سے اٹھکھیلیاں کرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ دوران سفر محمود اور نیاز کئی دفعہ عرشہ جہاز پر سمندر کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے لئے جاتے رہے۔ اب جبکہ منزل مقصود ۲۰۔۲۲ میل باقی تھی۔ دونوں ایک دفعہ پھر عرشہ جہاز پر گئے۔ سمندر کا نظارہ بہت ہی بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ نیشنیز آئی لینڈ کو جیسا سنتے تھے اس سے بڑھ کر پایا۔ تمام جزیرہ سبز مخمل کی ایک وسیع و عریض چادر نظر آرہا تھا جیسے سمندر میں بچھا دیا گیا ہو اور اکا دکا چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تشبیہ کی مناسبت سے سبز چادر پر مینا کاری کا حکم رکھتی تھیں ۳۰ کی صبح کو نو بجے جہاز سائنسول کے سامنے کھڑا تھا۔ "نالجیہ یونیورسٹی" کے ۱۵ طالب علم اس جگہ اترے۔ محمود و نیاز بھی ان میں شامل تھے۔ یونیورسٹی کی مجلس استقبالیہ نے نو وارد طلباء کو خوش آمدید کہا۔

* * * *

محمود و نیاز نالجیہ یونیورسٹی کے ہوٹل میں دوسری منزل پہ اقامت پذیر ہوئے۔ چونکہ تمام کمرے کیوبکل تھے، اس لئے بادل ناخواستہ دونوں دوستوں کو علیحدہ علیحدہ رہائش رکھنی پڑی۔ دیکھا جائے تو اصل چیز دل ہے۔ سو وہ اس دوران کافی قریب ہو چکے تھے۔ ہوٹل میں کسی کونے میں رہیں۔ دوریا نزدیک یہ ان کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ اکٹھے رہنے

سے ممکن تھا باہمی احترام و اخوت و محبت کا جذبہ بے تکلفی کی نذر ہو کر رہ جاتا۔ پھر نائیجیریا یونیورسٹی میں ان کا اصل مقصد حصول تعلیم تھا۔ اس لئے بھی یہ علیحدگی چنداں نقصان رساں نہ تھی۔

تھوڑے ہی عرصہ میں محمود نے نیاز کی طبیعت کو پوری طرح بھانپ لیا۔ اس پر یہ بات اچھی طرح کھل گئی کہ نیاز کے اندر اپنے مذہب، اپنی ملت اور اپنی قوم کی خاطر قربانی کا جذبہ غیر معمولی حد تک ناپید ہے۔ اس کا رنگ ڈھنگ اور چال ڈھال سب بتلا رہے تھے کہ نیاز مشرق سے زیادہ مغرب نواز ہے۔ نائیجیریا یونیورسٹی جس کا انتظام پہلے ہی مغربی تہذیب کے دلدادوں کی سرپرستی میں تھا، کے پانچ سال محمود کو کئی کٹھن مراحل کا پیغام سنا رہے تھے۔ دجل مغرب کی ہمہ گیری اور نیاز کی آزادیٔ طبع یہ دو طرفہ تطابق محمود کو ایک زبردست امتحان کے لئے للکار رہا تھا۔

محمود حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے فارغ اوقات کا اکثر حصہ نیاز کے پاس گزارتا۔ پہلا سال بخیر و عافیت گزر گیا۔ محمود کی نیک صحبت اور بے غرضانہ پند و نصائح خوشگوار تبدیلی لانے کا باعث ہوئیں۔ نیاز کے افکار و خیالات مائل بہ اصلاح نظر آنے لگے۔ جذبات و احساسات رو بہ اعتدال تھے۔ نتیجتاً اس کی آزادیٔ طبع عقل اور فہم کی روشنی میں ضبط نفس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر رضامند ہو گئی۔ ایک سال کی سعی و کوشش کے ان خوشکن نتائج سے محمود بہت خوش تھا۔ اس کی عام صحت اور چہرہ کی رونق بھی کسی باطنی سرور کی غماز تھی۔ الغرض محمود کو یقین ہو گیا کہ مزید ایک سال کے اندر اندر وہ ایک اور محمود تیار کر لے گا۔ تب دو محمود نائیجیریا یونیورسٹی کے دو ہزار مغرب زدہ نوجوانوں کو کامیابی سے مقابلہ کر سکیں گے۔ تاہم فی الباطن وہ اپنے اس خیال کی کبھی کبھی تردید کرنے لگتا کیونکہ "بروا" نیاز کے چکنے چکنے پات" ماحول کی اس سازگاری میں کم ہی حوصلہ افزا نظر آتے تھے۔

ایک سال گزر چکا تو حلقۂ واقفیت بھی ذرا وسیع ہوا۔ یونیورسٹی کے دوسرے طلباء سے راہ و رسم بڑھنے شروع ہوئے۔ محمود کے متعلق ان سب کا پہلا اور آخری تاثر یہ تھا کہ وہ اپنے مذہب اور قوم کا ایک غیور پہلوان ہے۔ وہ دوسری اقوام کی کورانہ تقلید کی بجائے صرف انہی حد تک ان کے خیالات کو اپناتا ہے جس حد تک اس کا مذہب اسے اجازت دیتا ہے۔ حکمت و دانائی کی ہر بات کو وہ اپنی کھوئی ہوئی متاع خیال کر کے فوراً اپنا لیتا ہے مگر جو بات اسے اپنے عقائد کی روشنی میں ضالۃ المومن کے حکم سے باہر نظر آتی ہے وہ اس کے خلاف ایک غیر متزلزل چٹان کی طرح ڈٹ جاتا ہے اور فوراً اپنے ہم خیالوں کو ایسی اخلاق سوز باتوں سے ہوشیار کر دیتا ہے۔ تخریب پسندوں اور مفاد پرستوں کے لئے محمود اور اسکے حلقۂ اثر میں کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ خوب جانتے تھے کہ محمود کی کامیابی کا نشان محمود ان کے حق کیلئے ایک کاری ضرب ہے۔ اس کا وجود مخالف عنصر کی یقینی ہزیمت کے لئے ایک کھلا ہوا چیلنج تھا۔

محمود کا اثر و رسوخ حسد اور کینہ کی آگ میں جلنے والے دشمن کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ یونیورسٹی کے کوئی درجن بھر طلباء نے جو کہ مختلف مذاہب اور فرقوں اور ہم خیال ٹولوں سے تعلق رکھتے تھے محمود کے خلاف ایک خفیہ محاذ کی بنیاد ڈالی۔ جس نے بعد میں اینٹی اسلام فرنٹ (Anti Islam Front)

کا نام اختیار کر لیا۔ پروگرام یہ طے پایا کہ محمود کو نیچا دکھانے کے لئے یونیورسٹی کے تمام مسلمان طلبہ کو اسلام سے بدظن کر دیا جائے بعض کو عیسائی بنایا جائے بعض کو یہودی اور بعض کو ہندو یا بدھ۔ اگر وہ ان مذاہب میں سے کسی کو قبول نہ کریں تو کم از کم ان کے اذہان میں دہریت کے جراثیم ضرور بھر دیئے جائیں اس غرض کے لئے بعض کمیونسٹ طلبا کو بھی یونین کا ممبر بنا دیا گیا۔ کمصو ایک عرب عیسائی کو اس یونین کا پریذیڈنٹ اور لائیکا لود ([illegible]) ایک کمیونسٹ جوان سال لڑکی کو وائس پریذیڈنٹ بنایا گیا۔ یورپین ممالک کی نمائندگی ایک انگریز طالب علم جمی (Jimmy) کے سپرد کی۔ وہ یونین کا جونیئر وائس پریذیڈنٹ بھی تھا۔ علاوہ ازیں ایک ہندو نے مشرقی ممالک کی نمائندگی کی۔ اسے یونین کا سیکرٹری بھی منتخب کیا گیا۔ اس طرح اندر ہی اندر یونیورسٹی کے بارہ چوٹی کے طلبا محمود کے خلاف متحد ہو گئے

یونین نے وجود میں آتے ہی پوری سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ اس کے ممبران ہوسٹل میں ہر مسلمان طالب علم کے پاس جاتے اور جس حد تک ممکن ہوتا جدید فلسفیانہ اصولوں کو بروئے کار لا کر ان کے پرسکون اذہان میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کرتے پہلے ان کے احوال معلوم کرتے۔ ان کی ضروریات اور ہجوم و غم میں موافقت کرتے تکالیف پوچھتے۔ تالیف شدگان کو نبا جتا کر پیش کرتے۔ پھر ہمدردی کا اظہار کرتے۔ انہیں امداد کے لالچ دیتے۔ الغرض ہر قسم کے سبز باغ دکھاتے۔ اور جانے سے قبل ایک آدھ جراثیم ایسے بھی چھوڑ جاتے۔ جو ان کے جذبہ ایمان کو کچھ دیر کے لئے پریشان کر دیتے تاہم جو طلبا محمود سے رجوع کرتے۔ وہ اپنی پریشانی سے جلد ہی خلاصی حاصل کر لیتے

محمود شر پسندوں کے اعتراضات کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیتا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اکثر مسلمان طلبا کو معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ ہرگز ہرگز ان کے ہمدرد نہیں بلکہ بھیڑیوں کے بھیس میں بدنیت بھیڑیئے ہیں۔ جو انکی دولت ایمان پر ڈاکہ ڈالنا چاہتے ہیں۔

اب جو یہ پروگرام سر چڑھتا نظر نہ آیا تو ان لوگوں نے ایک اور خطرناک منصوبہ بنایا۔ یونین کی عاملہ نے فیصلہ کیا کہ یہ بہت سارے "شیر" ایک ہی وقت میں جال میں نہیں پھنس سکتے۔ انہیں ایک ایک کر کے اسیر دام بنایا جائے۔ اپنی گزشتہ ملاقاتوں میں ان لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ یونیورسٹی کے تمام طلباء میں سے نیاز ان کی باتوں کا جلد اور زیادہ اثر قبول کرتا ہے۔ تجویز ہوا کہ "پہلا نشانہ" اسی کو بنایا جائے اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ محمود ایک دلی دوست سے محروم ہو جائے گا۔ جب دکھ درد کا ساتھی کوئی نہ رہا۔ تو وہ خود ہی مایوس ہو کر اپنی سرگرمیوں کو ترک کر دے گا۔

* * * *

عین ان ایام میں جبکہ یہ منصوبہ تیار ہو رہا تھا محمود اچانک بیمار ہو گیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ محمود کی بیماری کو اچھا شگون خیال کرتے ہوئے اس کے مخالفین نے اپنے منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے دن رات ایک کر دیا۔ کدصو آتا تو نیاز کو بہکا جاتا۔

"میں آج محمود کے پاس گیا وہ تمہیں بہت برا بھلا کہہ رہا تھا کہتا تھا وہ بھی کوئی آدمی ہے۔ جس طرف کسی نے لگا دیا لگ گیا۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اپنی زبان میں وہ بعض خاص الفاظ بھی کہتا۔ یہ سن کر اس کے دوست بہت ہنستے۔ کوئی

گالی ہی ہو گی۔ نیاز! تمہاری غیرت ایسے دوست کو کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ چھوڑو اس خشک مزاج مذہبی دیوانے کو۔ ایسے آدمی سے تو اچھی بھلا دیکھو! ہم لوگ تمہاری عزت کرتے ہیں۔ تمہارے مداح ہیں۔ اپنے وقت عزیز کا ایک بڑا حصہ تمہارے پاس گزارتے ہیں۔ تمہیں ہنساتے ہیں خوش گپیوں سے محظوظ کرتے ہیں۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود بھی تم ہر وقت محمود کے قبضے سے پڑے بیٹھے ہو۔ دنیا سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو ایسے دوستوں کو الوداع کہہ دو۔ محمود جو چند منٹ کے لئے آتا ہے تو بور (Bore) ہی کرتا ہے "نیاز! تم نے آج صبح کی نماز نہیں پڑھی۔ آج رات انگریزی بریو گرل (Brave girl) کیوں دیکھی؟ فلاں ٹرپ پر جانے کا بھلا کیا فائدہ تھا؟ کل عشاء کی نماز کے وقت بھی نہ معلوم تم کہاں غائب ہو گئے؟" اس کی کائیں کائیں نے تو تمہارا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ بھئی ذرا لائیکا کو دیکھو! بیچاری گھنٹوں تمہاری بے بسی کا نوحہ کرتی رہتی ہے۔ نیاز تم اس کے جذبات کا ہی احساس کرو۔ کب تک تم محمود کے غلام بنے رہو گے۔ سچ پوچھو تو اسے تم سے کچھ بھی ہمدردی نہیں۔ وہ تو تمہارا دماغ چاٹنے آ ٹپکتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ پریشان دماغ کیا خاک پڑھائی کرے گا۔"

محصو کی تقریر ختم ہوئی تو ادھر سے کلیمی بھی پاس آ دھمکا۔

"یہ دھان نیاز! یار تمہارے بغیر تو دل ہی نہیں لگتا۔ ہر وقت تمہاری جدائی لگی رہتی ہے۔ تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ دعا ہے پرمیشور ہمیشہ تمہیں سکھ سے رکھے۔ کبھی انڈین کارنر Indian Corner کی طرف بھی آ جایا کرو۔"

کلیمی دداس کی رام رام ختم ہوئی تو نیلی آنکھوں والا جینی چھوندر کی طرح آ پہنچا۔

"گڈ ایوننگ نیاز! کہیئے کیا حال ہے؟ تمہارا عطر

گل شبو بہت پسند آیا۔ لائیکا تو خوشبو پہ مری جاتی تھی۔ آج یہ تھرڈ بے پرمتی نے کچھ تحفے بھیجے ہیں۔ یہ نکٹائی بھی انہوں نے بھیجی ہے۔ میری طرف سے تحفہ قبول کرو۔ اور ہاں ٹرپ کا پروگرام کب بن رہا ہے؟"

جینی کی گڈ بائی (Good Bye) ابھی برآمدوں میں گونج رہی ہوگی کہ لائیکا تو دبے پیر کمرے آ دھمکے گی۔

"اچھے نیاز! محمود تمہارے افکار پر کب تک چھایا رہے گا۔ اس کی خاطر اپنی زندگی کی مسرتوں کو خاک میں ملا رہے ہو۔ ہوش کے ناخن لو اور آزادئی فکر کی نعمت کی قدر کرو۔ دیکھو میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ میری بات تو مانا کرو۔ چلو میرے ساتھ میرے پیارے نیاز۔ محصو، جینی، کلیمی اور قومی ڈنر کے سامنے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

لائیکا آن کی آن میں کمزور ارادہ نیاز پر چھا جاتی۔ نیاز کو اس کے سامنے بھلا کب مجال انکار!

* * *

محمود کی بیماری ذرا طویل ہو گئی۔ پورے پانچ روز وہ چارپائی پر پڑا رہا۔ دل میں بہت قلق کہ نیاز نے ایک دفعہ بھی آ کر مزاج پرسی نہیں کی۔ دشمنوں نے محمود کی بیماری سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ہر روز نیاز کے کان بھرے جاتے۔ اختتام کلام اس بات پر ہوتا کہ "دیکھو۔ اگر محمود نے یہ باتیں تمہارے خلاف نہیں کہیں۔ تو وہ تمہیں ملنے کیوں نہیں آیا؟ اس کا تو واضح مطلب ہے کہ وہ تمہارا سخت مخالف ہو گیا ہے۔ جب پانچویں روز محمود کی طبیعت قدرے سنبھلی تو لائیکا نے اپنا آخری حربہ چلایا۔ آتے ہی کہنے لگی:

"اچھے نیاز! تم پر سو جان قربان جاؤں! تمہارا دشمن مجھے کبھی کبھی تم تک پہنچنے نہ دے گا۔ ابھی ابھی محمود اور اس کے ساتھیوں نے

آج رات میرے پیارے کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس تمام منصوبے کا اصل سرغنہ محمود ہے۔ اگر تم میرے ساتھ پولیس سٹیشن تک جاؤ اور میری باتوں کی تصدیق کرو، تو ابھی محمود کو ارادۂ قتل کے الزام میں پکڑوایا جا سکتا ہے۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ ہوسٹل سے تمام بات کر لی ہے وہ مان گئے ہیں۔ بس تین گواہوں کی ضرورت ہے۔ تم، حبیب اور میں خود گواہی دے دیں گے۔ بس مزہ ہی آ جائے گا۔ تم آؤ میرے ساتھ چلو۔"

نیاز نے جب اپنے قتل کے منصوبے کے متعلق سنا تو آگ بگولہ ہو گیا۔ محمود کو بہت کچھ برا بھلا کہتا رہا۔ لائیکا کی طرف دیکھتا تو تشکر آمیز لہجے میں بار بار کہتا "لائیکا! میں تیرا بے حد ممنون ہوں۔ تم نے مجھے موت کے منہ سے بچا لیا۔ تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ تمہارا احسان اس قدر بھاری ہے کہ میں اسے تمام زندگی نہیں اتار سکوں گا۔"

لائیکا نے جب دیکھا کہ نیاز تو ابھی تک جا رہا ہے تو کہنے لگی: "ایک اور بات سمجھا دوں۔ محمود سے اب ہرگز نہ ملنا۔ بڑا چالباز آدمی ہے۔ کہیں تمہیں بہکانے کی کوشش نہ کرے۔ تم یہ عہد کر لو کہ آئندہ کبھی اس کی صورت نہیں دیکھو گے۔"

* * * *

محمود کو "سائیکول" ([illegible]) کی عدالت میں تین ماہ قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔ بیماری کی نقاہت ابھی باقی تھی کہ اچانک یہ مصیبت پڑ گئی۔ محمود کی صحت دن بدن گرتی گئی۔ داروغہ جیل نے رحم کھا کر محمود کو مشقت سے مستثنیٰ کر دیا۔ "انما الاسلام یونین" کا یہ دخل محمود کے لئے ایک صدمۂ عظیم تھا۔ وہ دن رات نیاز کی بے وفائی پر کڑھتا اور اس کے فہم و فراست پر رو دیتا۔ مگر اس ظلم عظیم کے باوجود بھی اس کے منہ سے نیاز کے متعلق کوئی برا کلمہ نہیں نکلا۔ حالانکہ وہ خوب سمجھتا تھا کہ خدا مظلوم کی آہ کو بہت جلد سنتا ہے۔ اس کے منہ سے صرف ایک ہی دعا نکلتی ـــــ اور وہ یہ کہ "اے میرے قادر و توانا خدا! تو نیاز کو راہ راست پر لا۔ قہر کے ہاتھ سے نہیں بلکہ پیار اور محبت کے ہاتھ سے۔ اس کے دل کی تمام کدورتوں کو صاف کر دے۔ اے غفور و رحیم خدا! بے شک نیاز نے مجھ پر ظلم کیا ہے مگر تو اسے ہر قسم کی آفات سے بچائیو۔ وہ میرا ہم وطن ہے اور ہم مذہب بھی۔ اس کا ظلم تسلیم۔ مگر یہ ایک لحاظ سے احسان بھی تو ہے۔ دیکھ اب میں تیری یاد میں زیادہ محو رہتا ہوں تو اسی بنا پر اسے معاف رکھنا اور اے مقلب القلوب! تو اس کے دل کو حق کی طرف پھیر دے۔ اور اس کے دل میں اسلام اور مجاہدین اسلام کی محبت پیدا فرما۔ اور اے مسبب الاسباب! تو اپنی خاص مشیت سے میری رہائی اور صحت کے سامان پیدا کر۔ دیکھ تیرے سوا میرے درد کا درماں اور کون ہے۔ میری تکلیف مجھ پر آسان کر دے۔ مجھے ہمت دے اور صبر کی توفیق عطا فرما۔"

وہ ہر روز اپنی نماز عشاء میں اور اسی قسم کی دوسری دعائیں نہایت درد اور الحاح سے کیا کرتا۔ اکثر اس کی سجدہ گاہ آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔

کچھ عرصہ بعد اسے نیاز کا ایک رقعہ ملا۔ اس میں لکھا تھا:

"محمود تم نے میرے متعلق بہت برا منصوبہ بنایا۔ خدا نے تجھے اپنے ناپاک عزائم میں خائب و خاسر کیا ہے اور ایسے ہو کہ تو ہمیشہ خائب و خاسر رہے۔ روسیاہی اور ذلت کی سزا بھگت لی۔ تو اسی کا سزاوار تھا۔ قید سے رہائی کے بعد مجھے اپنا منحوس چہرہ کبھی نہ دکھانا ..... تجھے خوشخبری ہو کہ میں نے تمہارے دین سے تائب ہو کر عیسائیت قبول کر لی ہے ....."

محمود نے جب یہ سطور پڑھیں تو اس کا آسمان امید یکلخت تاریک ہو گیا۔ دل پر شکستہ اور بخت برگشتہ خاطر ہو کر جیل کی دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اس کا جگر خون ہوا جا رہا تھا۔ مایوسی کے بادل اس

کے ہوش و حواس پر محیط ہو گئے۔ وہ ہمیشہ کے لئے نیاز کے راہ راست پر آنے سے ناامید ہو گیا۔ اسے اپنی آہوں پر کوئی بھروسہ نہ رہا۔ وہ انہیں بے تاثیر نالے سمجھنے لگا۔

★ ★ ★ ★

اس کا ایک دوست اطہر کبھی کبھار جیل میں آیا کرتا اور اسے تسلی دیا کرتا مگر اس کے پاس اب سوائے حسرت و یاس کے کلمات کے اور کچھ نہ تھا۔

"اطہر میں نے اپنے خدا سے وعدہ کیا تھا کہ میں نیاز کو ضرور راہ راست پر لاؤں گا۔ اور اس کی خامیوں اور کمزوریوں کو دور کروں گا مگر آہ! اب نیاز ہمارے ہاتھوں سے ہمیشہ کیلئے نکل چکا ہے۔ وہ تو اپنا چہرہ دکھلانے کا بھی روادار نہیں۔ مجھے نیاز کا گنگنایا ہوا یہ شعر بار بار یاد آتا ہے ؎

کمال ہوش ہے یوں بے نیاز ہو جانا
تیری آغوش میں بیگانۂ آغوش ہو جانا

نیاز کو کیا معلوم کہ محمود کا قلب و دماغ اور اس کے ادراک و حواس اسکی اصلاح احوال پر غور کرنے کے لئے وقف ہو چکے ہیں ؎

تمہارے ظلم، طعنے غیر کے لوگوں کے آوازے
مجھے اس عہد کی خاطر یہ سب کچھ بھی گوارا ہے

اب اطہر بھائی یہ حال ہے کہ

ع ناامیدی موت سے کہتی ہے اپنا کام کر

دل کے ارماں بھی غیر ہو چکے ہیں وہ بھی کہتے ہیں تو یہی ع

ہم نہیں سالتی تری بگڑی ہوئی تقدیر کے

میری راحتوں کی دنیا تو عرصہ ہوا مجھ سے چھن چکی۔ اب غم ہی غم ہیں۔ دل میں کراہنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ شاید اگر میں اک یونیورسٹی میں داخلہ نہ لیتا۔ تو نیاز ان لوگوں کے شکنجہ دل میں نہ آتا اور بدستور اسلام سے ہی وابستہ رہتا۔ ذرا میری نظمیں تو دیکھو۔ میرے نحیف و نزار دل کی ترجمان نظمیں! اے میرے غمگسار کیا تم ان کو محسوس کر سکتے ہو؟"

★ ★ ★ ★

اطہر ایک طرف یہ روداد غم سنتا اور دوسری طرف محمود کے لاغر جسم پر نظر دوڑاتا تڑپ کر رہ جاتا۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ محمود سے متعلق تو نیاز کسی کا سنتا ہی نہیں تھا۔

محمود کے رہا ہونے میں دو دن باقی تھے۔ اطہر حسب معمول محمود کی ڈھارس بندھا رہا تھا کہ دفعتاً غم کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ زار و قطار رونے لگا۔ وہ بار بار کہتا،

"اے میرے آقا! اے میرے خدا! کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر میں تجھ سے وعدہ نہ کرتا۔ وعدہ کو پورا کئے بغیر تیرے دربار میں حاضر ہونے کے احساس سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ افسوس صد افسوس میں نیاز کو راہ راست پر نہیں لا سکا۔"

پھر وہ دیوانہ وار "امید" کو پکارنا شروع کر دیتا ع

جاتی ہے اے امید کہاں دل اجاڑ کر

اطہر اسے تسلی دینے لگا۔ اس نے اسے یاد دلایا کہ کبھی وہ دن تھے کہ جب تکالیف اور مصائب کے مواقع پر تو ہمیں کہا کرتا تھا ع اے ہمت مردانہ راضی برضا ہو جا

آج میں بھی تجھے یہی کہتا ہوں —— مجھے امید ہے کہ تمہارا "صبر ضرور رنگ لائے گا"

★ ★ ★ ★

آنہ میریا (Anna Maria) جو کبھی مسلمان ہوتی تھی جیل کی طرف سے محمود کو کھانا دینے آیا کرتی تھی۔ گو مذہباً عیسائی ہو چکی تھی۔ لیکن اسلامی اثرات کے تحت ابھی تک پردہ

کی پابند تھی۔ وہ گزشتہ تین ماہ سے برابر یہ درد بھری داستان سنتی رہی تھی لیکن اسکے پتھر دل نے محمود کی حالت پر کبھی ترس نہ کھایا مگر آج تو وہ بھی بے اختیار ہو گئی ع

دشمن بھی چیخ اٹھا بے اختیار رو دیا

اس نے اپنے دل میں پختہ عہد کیا کہ جس طرح بھی ہو سکا وہ نیاز سے کل سے پہلے پہلے یہ تمام ماجرا کہہ سنائے گی چنانچہ اسی شام اس نے نیاز سے یہ تمام داستانِ درد و غم بیان کر دی۔ اس کے طرزِ بیان میں کچھ ایسا درد سمویا ہوا تھا کہ نیاز کا دل پسیج کر رہ گیا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ آنسہ نے کہا کہ اگر نظارہ بچشم خود دیکھنا چاہتے ہو تو میرا برقعہ حاضر ہے۔ محمود کو کل کھانا کھلانے جانا۔ تجھ پر یہ بات اچھی طرح کھل جائیگی کہ تو جسے ایک حقیقت سمجھتا تھا وہ ایک دجل ہے ایک حسین فریب، ایک سحر آفریں دھوکہ اور بس۔

* * * *

اگلے روز صبح، دوپہر، اور شام کا کھانا آنسہ کی بجائے نیاز نے محمود کو کھلایا۔ نیاز کی خاطر محمود کے دل میں کس قدر درد اور ہمدردی موجزن تھی۔ اب یہ کوئی راز نہ تھا بلکہ ایک واضح حقیقت تھی۔

جب وہ شام کا کھانا لایا تو محمود نمازِ مغرب کی ادائیگی میں مشغول تھا۔ نیاز اس سے قبل ظہر کے وقت ایک عجیب نظارہ دیکھ چکا تھا۔ وہ خاموشی سے جیل کے دروازے کے ساتھ لگ گیا۔ اور محمود کی راز و نیاز کی باتیں سننے لگا۔ وہ کافی دیر دعائیں کرتا رہا۔ جب درد و کرب میں ڈوبے ہوئے یہ کلمات اختتام کو پہنچ رہے تھے۔ تب محمود نے اپنی جیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے زندانِ محمود گواہ رہنا کہ محمود نے دوستی کا حق اپنی ہمت سے بڑھ کر ادا کیا اور تو گواہی دینا کہ نیاز بے وفا نکلا۔ اور اس نے محمود کے نیک جذبات کو ٹھکرا دیا۔ اور اے زندانِ محمود کے در و دیوار! تم بھی گواہ رہنا کہ تم نے میری شبانہ روز آہ و بکا سنی ہے۔ کیا تمہیں کبھی یہ شک گزرا۔ کہ میں نے نیاز کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا...... میں اس تکلیف سے معافی چاہتا ہوں جو تم نے میرے دن رات نالوں کے باعث اٹھائی۔ مجھے امید ہے کہ تم حق رکھتے ہوئے بھی ایسی سنگدلی کا مظاہرہ نہیں کرو گے۔ جس کا نیاز نے ناحق میں کیا۔"

محمود کی ہچکی بندھ چکی تھی۔ نیاز اگرچہ یہ الفاظ سن کر گھائل ہو رہا تھا۔ مگر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے آپ کو راز میں رکھے۔ ایک لمحہ بہرحال ایسا بھی آیا۔ جبکہ نیاز کا دل چاہا کہ وہ اپنے مخلص ترین دوست محمود کے ساتھ لپٹ کر زار و قطار رو دے اور اس کا شریکِ غم بنے۔ دلفگار محمود کا قلب ناتواں ان گنت زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ڈوبا جا رہا تھا ——— نیاز کا پیمانۂ صبر چھلکا ہی چاہتا تھا۔ کہ محمود کی آہ و فغاں قدرے کم ہوئی۔ کھانا کھلا کر نیاز شہر واپس ہوا۔

* * * *

جیل سے رہا ہو کر محمود نائجیریا یونیورسٹی منتقل ہو چکا تھا۔ دشمن کے گھر پر پھر یاس کے بادل چھانے لگے۔ لیکن محمود دشمن کی طرح سنگدل نہ تھا۔ اسے تو دشمنوں کو بھی دوست بنانا تھا ——— جب دشمنوں کو اپنے کئے پر نادم پایا تو سب کو معاف کر دیا۔

نیاز کا غم البتہ اب بھی اس کے دامنگیر تھا۔ وہ اس کی رہائی سے دو روز پہلے ہی غائب ہو گیا تھا۔ محمود کے صاف دل میں بھلا بغض اور کینہ کہاں۔ وہ تو ایک لمحہ کے لئے بھی نیاز کا تعلیمی حرج نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ تو ہر مسلمان طالب علم کے لئے یہ خواہش

(باقی دیکھیں ص ۱۹ پر)

انعام اللہ ہاشمی
ف۔ اے سال اول

ناقابلِ فراموش

موسم بہار میں ہر طرف لہلہاتے کھیت ایک دلکش منظر پیش کر رہے تھے۔ اودے اودے بادل آسمان کی نیلگوں فضا کو اور زیادہ دلکش اور دلربا بنا رہے تھے۔ ایسے موسم میں لہلہاتے کھیتوں، مرغزاروں اور باغوں کی سیر مسرت کے پیغام لاتی ہے مگر افسوس ہمارے لئے یہ موسم کچھ وبالِ جان ہی ثابت ہوا۔

حمید اور خلیل میرے چند گہرے دوستوں میں سے تھے۔ جنہوں نے اگرچہ ہر منزل پر میرا ساتھ تو نہیں دیا تھا مگر کبھی کبھار کی ملاقات سلیقہ بعض اوقات آڑے آ جاتی تھی۔ لہلہاتے کھیتوں، سرسبز میدانوں اور باغوں میں ہماری کبھی کبھار کی سیر ہماری رعنائیوں میں اور زیادہ اضافہ کا موجب ہو جاتی۔ ۔ ۔ ۔

نوماہی امتحان ختم ہوا جان میں جان آئی پچھلے مہینوں کی مسلسل پڑھائی اور امتحان کے زور نے راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ اچھے سکون ملا تو سیر کا خیال دماغ میں موجزن ہوا۔ ہر طرف کماد کے لہلہاتے کھیتوں نے اس خیال کو اور زیادہ تقویت دی۔ خلیل اور حمید سے گفتگو کی۔ وہ بھی ہم خیال نکلے۔

وسط دسمبر کی بات ہے امتحان ختم ہو چکا تھا اتوار کی شام کے دھندلکے میں ہم تینوں گندم کے کھیتوں کو عبور کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ تھوڑی سی مسافت کے بعد ہم کماد کے کھیتوں میں گھر چکے تھے تین طرف کماد تھا اور ایک طرف گندم کا کھیت۔ دل جو للچایا تو بے قابو ہو گیا۔ پھر کیا تھا میں اور حمید کھیت میں گھس گئے اور خلیل باہر رکھوالی کے لئے کھڑا ہو گیا۔ دو تین گنے توڑے ہوں گے کہ خلیل کی ذرا اونچی چیخ سنائی دی۔ باہر نکلے تو اس کا رنگ زرد پڑ جا رہا تھا — دور سے ایک لمبا تڑنگا کالا کلوٹا آدمی بھاگا چلا آ رہا تھا۔ ہم سمجھ گئے یہی اس کھیت کا رکھوالا ہے۔ میں اس شعر سے دل بہلانے لگا

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گئے

میرا اور حمید کا رنگ بھی فق ہو گیا۔ گنے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر پاؤں تو زمین میں گڑ چکے تھے۔ شرم اور خوف کی وجہ سے ہم پسینے میں شرابور ہو گئے۔ اگرچہ ہم تین تھے مگر خوف ہم تینوں پر حاوی تھا۔ نہ گنوں کا ہوش نہ اپنی جان کا۔ ہم ایک انجانی منزل اور انجانے راستے پر رواں ہو گئے تھے۔ تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ ایک نئی آفت میں گرفتار

ہو گئے۔ اس شخص کے شور و غل نے ہمارے راستہ
کی وسعت کو اور محدود کر دیا۔ ہمارا راستہ بند ہو چکا
تھا۔ اس ناگہانی مصیبت نے ہم کو اور زیادہ
خوفزدہ کر دیا۔

اب ہم دشمن کے ہاتھ میں تھے۔ ایک ——
دو —— تین —— چار۔ آٹھ —— بارہ —— میں مرا
—— میں زور سے چلایا —— سب سے بڑا تھا اس
لئے سب سے زیادہ شامت میری ہی آئی۔ رونے اور
چلانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ دو تین مزید چپت
رسید ہوئے۔ میری باری ختم ہوئی۔

حمید نے ابھی ایک ہی گھونسہ کھایا ہو گا کہ
میں نے ایک چال چلی۔ یکدم بھاگنے کی کوشش کی۔
سب لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ میں دوبارہ پکڑا
گیا۔ مگر میری اس کوشش سے حمید مار سے بچ گیا۔
اب پھر میری شامت —— مگر اب کے ان لوگوں
کو ترس آ گیا۔ ابھی ایک طرف سے چھٹکارا نہیں ملا
تھا کہ ہم ایک نئی مصیبت میں پھنس گئے۔ ہوا یہ
کہ ایک موٹا تازہ مشٹنڈا گنوں کا ایک گٹھا لئے
ہوئے وہاں پر پہنچ گیا اور اس نے مشینی ٹوکے
کے پاس ان کا ڈھیر لگا دیا۔ تاکہ بھینسوں وغیرہ کے
لئے چارہ بنایا جائے۔ اس نے جو ہماری حکایت سنی۔
تو ساتھ ہی ایک بڑی ساری غلیظ گالی اگل دی اور
پھر بڑا عمدہ مشورہ دیا کہ لگا دو ان کو ٹوکے پر ——
پھر کیا تھا چارہ ناچار ٹوکا چلانا پڑا۔ یوں
محسوس ہو رہا تھا جیسے بانس کاٹے جا رہے ہیں۔ جیسے

اور حمید بالکل تھک چکے تھے۔ آخر میں نے خلیل کو
ساتھ ملا لیا۔ اور پھر تھوڑی دیر لیے حمید اور خلیل
ٹوکا چلانے لگے اور میں مزے سے گنڈیریاں چوسنے
لگا۔ پہلی جو منہ میں گئی تو بس مزا آ گیا۔ دل چاہا کہ
ایک ہی وار میں ان سب کو ختم کر دوں۔

آخر مسلسل آدھ گھنٹے کی "مشقت" کے بعد
ہمیں چھٹکارا ملا اور ہم درماندہ حالت میں ٹوٹتے ہوئے
جسموں کے ساتھ ہارے ہوئے جواری کی طرح واپس لوٹ
آئے۔ اس وقت میری حالت کا آتش نے یوں نقشہ
کھینچا ہے ؎

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا

ان کے حق میں دعائے خیر کی بجائے ثقیل الفاظ
سے دل ٹھنڈا کیا۔ اگرچہ میں گالی دینے کا عادی نہیں
تھا۔ مگر اس دن نہ معلوم میری یہ زبان کیوں زیادہ
بے لگام ثابت ہوئی۔

وقت کسی کا ساتھ نہیں دیتا وہ گزر جاتا ہے۔ وقت
کے تیز و تند دھارے کے ساتھ ساتھ یہ دن گزر گیا
ہفتے گزرے اور مہینے گزرے۔ پھر سال گزرے اور
آج اس واقعہ کو تقریباً چار سال ہو گئے۔ مگر وہ واقعہ
میرے دماغ کے نہاں خانوں میں جوں کا توں قائم ہے۔ اگرچہ
میرے ساتھی اس واقعہ کو بھول گئے ہوں گے۔ مگر مجھے
وہ واقعہ آج بھی یاد ہے جس طرح اس دن سے

یقائے لالہ و گل میں جھلک رہی تھی خزاں
پھری بہار میں رو دیا گئے بہار کو ہم

افسانہ
سیف الزماں

کفرانِ نعمت

وہ ایک غریب والدین کا نورِ چشم تھا۔ انور اس کا نام تھا۔ ذہین اور ہوشیار ہونے کے علاوہ وہ پڑھائی کا بہت شوقین تھا اس نے نویں جماعت ابھی پاس ہی کی تھی کہ اس کی والدہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئی۔ بوڑھے باپ کو اس عظیم سانحہ سے بہت ٹھیس پہنچا۔ خود انور کی بُری حالت تھی اس کے دل پر گویا چھریاں چل رہی تھیں۔ متوفیہ کو شام کے قریب سپردِ خاک کر دیا گیا۔ انور ہر روز تیسرے دن ماں کی قبر پر جاتا اور دعائے مغفرت کرتا اس نے اپنے باپ کی غریبی کو مدِنظر رکھتے ہوئے میٹرک کے امتحان کی خوب تیاری کی۔ وہ سکول میں اول قرار دیا گیا۔

اس خوشگوار موقعہ پر لڑکے اسے مبارکباد دیتے مگر وہ بے دلی سے انہیں وصول کرتا۔ وہ خوش نہیں تھا۔ اس کو ان حسین لمحات کی طلب تھی جب اس کی پیاری ماں اس کی خوشی میں شریک ہوتی۔ وہ اسی ادھیڑبن میں شہر خموشاں میں جا پہنچا۔ دیر تک ماں کی قبر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر خدا سے دعا مانگی۔ بے ساختہ اس کے منہ سے یہ کلمات نکل رہے تھے۔

"پیاری ماں! دیکھ میں نے دسویں میں کتنے اچھے نمبر لئے ہیں۔ کاش تو بھی مجھے اس خوشی کے موقعہ پر مبارکباد دیتی۔ میری اس کامیابی پر مٹھائی بانٹتی۔ لیکن ماں! دیکھ!! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر حلف اٹھاتا ہوں کہ میں ترقی کے زینہ پر گامزن ہونے کے لئے اور خاندان کی عزت کو عروج تک پہنچانے کے لئے پوری پوری کوشش کروں گا۔"

جب اس کے والد خیرالدین کو اس نتیجہ کا پتہ چلا تو وہ بہت خوش ہوا۔ لیکن انبساط کے ساتھ ساتھ اسے افسوس بھی تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر نوری زندہ ہوتی۔ اس شام خیرالدین نوری کی قبر پر گیا۔ اور نہایت دردمندانہ لہجہ میں کہنے لگا۔

"اے نیک بخت خاتون! دیکھ خدا تجھ پر کتنا مہربان ہے۔ تیرا بیٹا سکول میں اول آیا ہے۔ پروردگار تیری روح کو تسکین دے۔ تیری پاک آرام گاہ کے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو سکا۔ انور کو تعلیم دلواؤں گا۔"

خیرالدین نے تنگ دست ہو کر اور اپنی

ضروریات کو کم کر کے لاڈلے بیٹے نور کو کالج میں بھیج دیا۔ جب کبھی وہ ماہ دو ماہ بعد گاؤں آتا تو جیب شدہ رقم جو کہ منیر الدین اتنے عرصہ میں بچا رکھتا تھا لے جاتا۔ ماں کی ممتا اس کے دل میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ جب کبھی وہ گھر آتا تو اپنی والدہ کے مزار پر ضرور جاتا۔ فرسٹ ایر کا امتحان اس نے نہایت جانفشانی اور محنت سے دیا۔ اور جب نتیجہ نکلا تو وہ دو مضامین فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے کے علاوہ آرٹس گروپ میں بھی اول رہا۔ تقسیم انعامات کے موقعہ پر اس نے بہت سے انعامات حاصل کئے۔ اس کے بعد جب وہ گاؤں پہنچا۔ تو اسے راستہ میں قبرستان کے نزدیک سے گزرنا تھا جہاں اس کی والدہ ابدی نیند سو رہی تھی۔ انور کا دل بے قابو ہو گیا۔ اس کے قدم گورستان کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ ماں کی قبر پر گرا اور بے اختیار اور بے کل ہو کر وہ کہہ رہا تھا۔

"امی! میری اچھی امی!! دیکھا میں کتنے انعام لایا ہوں۔ کیا تجھے یہ پسند نہیں ہے؟ کیا تو مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ پھر تو خاموش کیوں ہے!!! اس لئے کہ میں عرصہ دراز کے بعد یہاں آیا ہوں۔ مجھے معاف کر دے میری پیاری امی!" اس کی آواز بھرا گئی۔ آنسو اس کے رخساروں سے بہتے ہوئے قبر کی کچی سطح پر پھسلنے لگے وہ اٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے با دل ناخواستہ گھر کو چل دیا۔

منیر الدین کا کاروبار گرچکا تھا۔ لیکن تمام تکالیف و مشکلات کے باوجود وہ انور کا خرچ برداشت کر رہا تھا۔ آخری دفعہ انور کو گئے ہوئے چھ ماہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ ایک دن انور کا تار آیا کہ داخلہ بھیجنے اور چند ایک کتابیں خریدنے کے لئے دو سو روپیہ کی فوری ضرورت ہے۔ موقعہ کو مناسب جان کر منیر الدین نے خود ہی شہر جانے کا فیصلہ کیا۔ ڈیڑھ سو روپیہ اس نے پہلے ہی پس انداز کیا ہوا تھا۔ پچاس کہیں سے ادھار لئے اور کالج جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ گاؤں چھوڑنے سے پہلے وہ اپنی مرحومہ بیوی نوری کی قبر پر گیا اور کہنے لگا۔

"نوری! میری نیک خصلت بیوی!! خدا تعالیٰ تجھ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے تو یقیناً فرحت محسوس کرتی۔ یہ معلوم کر کے کہ میں باوجود مصائب کے اپنا عہد پورا کر رہا ہوں۔ تیرے انور کو پیسوں کی ضرورت تھی۔ آج میں دو سو روپیہ جو میں نے خون پسینہ ایک کر کے کمایا ہے اسے پہنچانے جا رہا ہوں۔"

وہ پہلی دفعہ کالج کی طرف جا رہا تھا۔ پھٹے پرانے کپڑے اور ٹوٹا ہوا جوتا پہنے ہوئے۔ جب وہ ہوسٹل کے گیٹ کے قریب پہنچا تو اس نے پاس کھڑے ہوئے لڑکے سے انور کا پتہ پوچھا۔

"انور آپ کا کیا لگتا ہے؟" لڑکا عجیب نظروں سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

"وہ میرا بیٹا ہے" بوڑھے نے جواب دیا۔

"لیکن وہ تو اپنے آپ کو ایک بہت بڑے

دینِ محمدؐ

حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ

ہر طرف فکر کو دوڑا کے تھکایا ہم نے
کوئی دیں دینِ محمدؐ سا نہ پایا ہم نے

کوئی مذہب نہیں ایسا کہ نشاں دکھلاوے
یہ ثمر باغِ محمدؐ سے ہی کھایا ہم نے

مُصطفیٰ پر ترا بے حد ہو سلام اور رحمت
اس سے یہ نُور لیا بارِ خدایا ہم نے

ربط ہے جانِ محمدؐ سے مری جاں کو مدام
دل کو وہ جام لبالب ہے پلایا ہم نے

اس سے بہتر نظر آیا نہ کوئی عالم میں
لاجرم غیروں سے دل اپنا چھڑایا ہم نے

موردِ قہر ہوئے آنکھ میں اغیار کی ہم
جب سے عشق اس کا تہِ دل میں جمایا ہم نے

تیرے مُنہ کی ہی قسم میرے پیارے احمدؐ
تیری خاطر سے یہ سب بار اٹھایا ہم نے

آنکہ در خوبی ندارد ہمسرے

حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ

در دلم جوشد ثنائے سرورے
آں کہ در خوبی ندارد ہمسرے

آں کہ جانش عاشقِ یارِ ازل
آں کہ روحش واصلِ آں دلبرے

آں کہ مجذوبِ عنایاتِ حق است
ہمچو طفلے پروریدہ در برے

آں کہ در برّ و کرم بحرِ عظیم
آں کہ در لطفِ اتم یکتا دُرے

آں کہ در جُود و سخا ابرِ بہار
آں کہ در فیض و عطا یک خاورے

آں رحیم و رحمِ حق را آیتے
آں کریم و جُودِ حق را مظہرے

آں رُخِ فرّخ کہ یک دیدارِ او
زشت رُو را میکند خوش منظرے

دردِ اسلام

حضرت امام جماعت احمدیہ

غم اپنے دوستوں کا بھی کھانا پڑے ہمیں
اغیار کا بھی بوجھ اُٹھانا پڑے ہمیں

اس زندگی سے موت ہی بہتر ہے اے خدا
جس میں کہ تیرا نام چُھپانا پڑے ہمیں

منبر پہ چڑھ کے غیر کہے اپنا مدعا
سینہ میں اپنا جوش دبانا پڑے ہمیں

یہ کیسا عدل ہے کہ کریں اور۔ ہم بھریں
اغیار کا بھی قضیہ چکانا پڑے ہمیں

سُن مُدعی نہ بات بڑھا، تا نہ ہو یہ بات
کُوچہ میں اُس کے شور مچانا پڑے ہمیں

اتنا نہ دُور کر کہ کٹے رشتۂ وداد
سینہ سے اپنے غیر لگانا پڑے ہمیں

پھیلائیں گے صداقتِ اسلام کچھ بھی ہو
جائیں گے ہم جہاں بھی کہ جانا پڑے ہمیں

پروا نہیں جو ہاتھ سے اپنے ہی اپنا آپ
حرفِ غلط کی طرح مٹانا پڑے ہمیں

محمود کر کے چھوڑیں گے ہم حق کو آشکار
رُوئے زمیں کو خواہ ہلانا پڑے ہمیں

پروفیسر محمد شریف خالد

غزل

امید بھی وہی ہے ارمان بھی وہی ہے
ہاں درد بھی وہی ہے درمان بھی وہی ہے

یہ کائناتِ عالم مرکوز ہے اسی میں
غنچہ و گل وہی ہے بستان بھی وہی ہے

بے کیف و بے ضرر کیوں ہیں محفلیں ہماری
آرائشِ مکاں بھی سامان بھی وہی ہے

درماندگی کے ہاتھوں مجبور ہوں میں ورنہ
یہ کھیل بھی وہی ہے میدان بھی وہی ہے

آغاز ہی میں دھوکا مَیں کھا گیا تھا ورنہ
گوئے جہاں وہی ہے چوگان بھی وہی ہے

خالد نہیں ہیں اب وہ پہلی سی آرزوئیں
گرچہ یہ تن وہی ہے اور جان بھی وہی ہے

مکرم روشن دین صاحب تنویر

غزل

نہ کھا غم زندگی کا سم یہی ہے
نہ کھا جائے اسے غم، غم یہی ہے

مئے ساقی کا ہر قطرہ ہے عالم
اسی کے در پہ جم جا، جم یہی ہے

فرشتوں سے کرایا جس کو سجدہ
خدایا! کیا ترا آدم یہی ہے

کیا ہے راز تیرا دل نے افشا
اسی سے کہہ ترا محرم یہی ہے

زیادہ جانتے تھے سب سے دل کو
مگر دیکھا تو سب سے کم یہی ہے

مکرم قاضی اکمل صاحب

غزل

نہ سن ہمنوا بے وفاؤں کی باتیں
یہ بیداد گر ہیں نہ تیرے نہ میرے

گلستانِ احمدؐ میں آئیں بہاریں
حریفوں نے ہر چند کانٹے بکھیرے

مرے دل کو اک روشنی بخشتے ہیں
ترے مشک بو گیسوؤں کے اندھیرے

ادھر سے جو گذرو تو آکر یہ دیکھو
ہے جنگل میں منگل فقیروں کے ڈیرے

ہے اکمل سے کیا پوچھنے کی ضرورت
کہاں جا رہے ہو سویرے سویرے

ارشد ترمذی

غزل

بُھلایا جس نے ہم کو آج اس غافل کی یاد آئی
مجھے وہ شوخ یاد آیا اُسی قاتل کی یاد آئی

صدا سُن کر درا کی پھر کسی محمل کی یاد آئی
الٰہی آج کیوں مجھ کو متاعِ دل کی یاد آئی

نظر آنے لگی بے رنگ سی کیوں آج کی محفل!
نہ جانے آج اس محفل میں کس محفل کی یاد آئی

نوائے شوق میں پرواز تھی گو عرش سے آگے
جو پیچھے رہ گئی تھی مجھ کو اس منزل کی یاد آئی

رُکی تھی چند لمحے جس پہ ناؤ میری اُلفت کی
مجھے پھر شورِ طوفاں میں اسی ساحل کی یاد آئی

دھڑکتا ہے یہ دل پہلو میں یوں رُک رُک کے کیوں ارشدؔ
یہ مجھ کو جادۂ الفت کی کس مشکل کی یاد آئی

چراغ شب

"نالہ پابندِ نَے نہیں ہے"

(۱)

حسین ذرّوں کی کہکشاں میں
غم و الم کی سیاہ راتیں
قرار بن کر۔ نکھار بن کر
جمیل پھولوں کا ہار بن کر
لپٹ رہی تھیں قدم قدم سے
قدم قدم پہ نفس نفس سے

(۲)

وہ کارواں جو بھٹک رہا تھا
جُھلستی راہوں پہ ننگے پاؤں
برس برس سے صدی صدی سے
چراغ شب کی کرن کرن نے
نقیب بن کر انہیں پکارا
خدا کی چادر کا تم پہ سایا
خدا کی چادر کے سائے سائے
لو اپنی منزل پہ جا کے دم لو۔

(ہدایت اللہ ہادی)

"زخمی یاد"

(۱)

راستے اجنبی سے لگتے ہیں
راستے جن پہ مدتوں ہم نے
فکر تعمیر نو جہاں کی تھی
راستے جن کی تیرہ بختی کو
تیرے عارض کی جگمگاہٹ نے
رنگ بخشا تھا روشنی دی تھی
راستے جن پہ ہم نے پہلی بار
ان روایات کے ستونوں کی
کہنہ زنجیر توڑ ڈالی تھی

(۲)

راستے جن پہ چلتے چلتے ہم
پیار کی مملکت میں پہنچے تھے
مملکت وہ کہ جس میں ہم دونوں
مطلق الحکم تھے شہنشاہ تھے

(۳)

اب میں اُن راستوں پہ تنہا ہوں
اب نہ تُو ہے نہ تیری آہٹ ہے

(نعیم قدسی)

مکرم عبدالسلام صاحب اختر ایم اے

غزل

ہیں ہمارے دل میں جلوے طور کے
بھر دیئے ساغر کسی نے نور کے

ہمنشیں! تقلیدِ مغرب پہ نہ جا
ڈھول ہوتے ہیں سہانے دُور کے

دیکھ خود اپنے وطن کی سرزمیں
یہ مظاہر شاہدِ مستور کے

ملگجے کھیتوں پہ یہ سرسوں کے پھول
جس طرح لڈو ہوں موتی چُور کے

جلوہ ہائے صبحگاہی ہیں قریب
آبگینے جس طرح بلّور کے

خالقِ مختار کو آئے پسند
زمزمے۔ میرے دلِ مجبور کے

گرچہ ہیں گھٹیالیاں میں شب بسر
ہم نفس ہم ہیں مسافر دُور کے

AL-MANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE

RABWAH

Oct,, Nov., Dec.

1962.

Editor-in-Chief
IJAZUL HAQ QURESHI

Editor
HASSAN MUSTUN

Contents

S. No.		Pages
1.	Editorial	... 1
2.	Why International Trade ? *Rashid Ahmad Javed*	... 3
3.	Woman in Islam *Dr. Muhammad Ramazan*	... 7
4.	On Liberty *Ijaz-ul-Haq Qureshi*	... 10
5.	College Round up	... 14
6.	Science & Civilization *Abdul Jalil Sadiq*	... 17
7.	Uganda's Wild Life Conservations *A Rafey Jafreé*	... 21
8.	Blood of Homosapien *Ata-ur-Raheem Hamid*	... 23
9.	Freedom of Conscience *Ata-ul-Mujeeb Rashad*	... 25
10.	Bacteria *Maqbool Malik*	... 27
11.	Why Pain in Twentieth Century *Fazal Ahmad*	... 30

Printed at the Nusrat Art Press, Rabwah, and
Published by A. R. Junaid for T. I. College, Rabwah.

In Memoriun

We place on record our deep sense of shock and grief at the sad and sudden demise of Justice M. R. Kayani, the former Chief Justice of West Pakistan High Court. With his death Pakistan and indeed the world has lost a great man in every sense of the word. With his qualities of head and heart, his courage, his brilliance, his scintillating wit, and humanism, he symbolised the highest values which we cherish. The year before last, he delivered his great convocation address at our College and won everybody's heart by his simplicity, humility, sincerity and irrepressible sense of humour. He was, indeed, a great son of Pakistan. We express our heartfelt sympathies to the bereaved family who have the consolation of feeling that are not alone in condoling his death, which came as a great shock to every Pakistani, big or small.

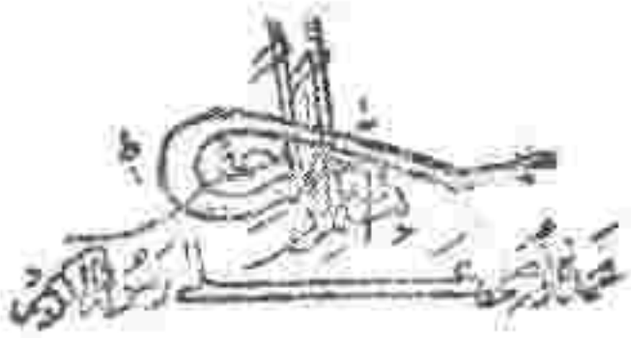

AL-MANAR

Talim-ul-Islam College, Rabwah

Vol. XII	Oct., Nov., Dec. 1962	No. 1

Editorial

Through the sustaining grace of God, a new academic year has seen its dawn. It is highly encouraging that during the last year remarkable progress has been achieved and we optimistically look forward that we, the torch-bearers, will leave no stone unturned to uplift the prestige of our institution.

Our aim and purpose in joining this institution is not only to attain glory and fame but also to prepare ourselves for facing the tremendous hardships and obstacles in life. It is of paramount importance that we develop a lofty character, a high standard of morality and create a spirit of hardwork. Our path of progress may be hindered by tremendous difficulties, but with sustained effort, high courage and stead-fast perseverance we can achieve our cherished goal in the pursuit of our high objective.

Verily man is born free—free to think, free to live his life in the secret places of his own heart, but without proper guidance, this freedom of thought might be detrimental, might be the cause of his failure in life. But if we learn to view our life in a proper angle and tackle our problems in the light of Islamic teachings, success will be a certainty.

We should consider ourselves lucky to be in such an institution where religious education is imparted in its true sense. We are provided with opportunities to put the teachings of Islam into practice. Therefore, we should not fail to avail ourselves of this golden chance.

Extra Curricular Activities :

Beyond the monotonous academic atmosphere of our lecture rooms, there are many other exhilerating activities ; some for enlightening our intellects, the others for relaxing our bodies.

In the first category we may include debates and declamations held under the auspices of the College Union and other literary societies of the college. Here the students inculcate the habit of pondering over problems and give vent to their feelings. This assists them to engender broad and objective outlook which is of paramount importance in daily life. That is to say, these societies are training fields for becoming excellent thinkers as well as speakers.

There are, on the other hand, outdoor games for which special arrangements are made in the college. Games and sports are essential to relax our body and lighten the heavy strain of studies. Rigorous muscular activities not only develop healthy physique but also sharpen mental faculties and give qualities of alertness, decision, determination, concentration and self control which are essential for success in life. 'A sound mind in a sound body' goes the proverb ; hence the students ought to take part in sports. But they must bear in mind that they are to play games for games' sake and not for gaining victory by fair means or foul. "In any case", says Ernest Barker, "a game is essentially 'play'—an activity for its own dear sake, and not for the sake of 'ashes' or palms or prizes".

Too much indulgence in extra-curricular activities is a curse if the student's main object of acquiring education is lost sight of. Experience points out that students who are good debators and excellent players, with the exception of a few, generally lack in studies. Better had it been if they had devoted less time to such activities and won laurels in their academic career, too. So it is our first and foremost duty to adopt temperance in extra-curricular activities.

Ch. Rashid Ahmad Javed

Why International Trade ?

"Trade is merely an exchange of one kind of goods for another. Yet it is one of the most important of man's social inventions, for it freed the isolated individual from the need to produce all his own requirements. Instead of being a "Jack-of-all-trades and master of none,"..... he could become a specialist" (P. T. Ellsworth)

Nations cannot live in isolation any longer effectively than can individuals. With the recent advance in technology, ranging from discovery of fire down to the latest electronic devices, specialisation has gained momentum and its field is ever widening. This specialisation, which first brought dependence between individuals, has now made the world a mutually inter-dependent compact.

For many nations foreign trade is a question of life and death. Had Europe been unable to draw upon the resources of other regions of the world, European people would have been enjoying a considerable low standard of living. It would have been fairly less than the one available at the present time.

The importance of international trade has grown to a much greater extent in recent times so much so that even for Russia and U.S.A.—far more economically independant countries—external trade is extremely vital for the material welfare of their people. Coffee, tea, chocolate, *bananas* and other tropical fruits are imported from abroad. Moreover rapid exhaustion of the deposits of these countries will make them more and more dependent on international trade in the near future.

Inter-regional Vs. International Trade :

The difference between inter-regional and international trade is that of degree rather than of kind. Basic and fundamental laws are the same. Both emerge from division of labour. Exchange of goods takes place through persons—in international trade persons being the nationals of various countries.

Inter-regional trade implies that individuals of a country specialise themselves in the production of those goods for which the resources of the country are best suited. Quite similar to that is the case for international trade. Different countries concentrate in the production of those goods for which the resources of the country are best fitted. They produce them at the lowest possible cost, export the surplus over their consumption and get in return those articles which involve comparatively higher cost at home.

As for consumers, they are indifferent as to purchase things in a particular market—domestic or foreign. They will always go to the cheapest market. Thus the underlying principles are very similar to each other in both the cases.

From Inter-regional to International Trade :

Justification of the inter-regional trade lies in the fact that there exists, a certain sort of specialisation and division of labour. Differences in geographical and climatic conditions, in the tastes and aptitudes of people and in the supplies of capital goods available in various parts of a country, spare no way out except inter-regional specialisation and hence trade. Allowing for the fixed existence of the productive resources and geographical environments, resources will be most efficiently used when they are employed in the most befitting line of production. Thus we see that East Pakistan must produce jute and rice while West Pakistan must adhere to the production of wheat and cotton. It reveals that each wing is entitled to have "absolute advantage" in producing some specific commodities. It is so because comparable amounts of productive resources will obviously, for reasons given above, produce more and cheaper jute in East Pakistan and wheat in West Pakistan.

Digressing now from inter-regional trade we enter into the international field. Different nations, like different regions and parts of a country, have great differences in their production possibilities. There are some fundamental factors which are responsible for these differences in various countries and are responsible for costs. We consider some of them below :

(i) **Geographical and Climatic Differences :** Special facilities are provided by natural resources. Geographical and climatic conditions vary widely in different countries. Hence a country may, due

to monopoly, enjoy an absolute gain in producing some particular commodity. The Brazilian soil is extra-ordinarily suited for producing coffee.

(ii) **Differences due to Immobility of Factors of Production** : International immobility of resources also counts much for the differences in costs. Labourers love their mother country. Moreover differences in languages, customs and tradition discourage people to leave their native land. Capital seeks safety at home. Grave differences in interest rates also play an important role.

(iii) **Human Capacities differ** : Some nations have physical superiority over others. People living in hilly tracts are physically strong and adopt more physical labour. Long standing racial qualities and political, social and economic environments and the structure of life are responsible for these differences.

(iv) **Differences in Accumulated Supply of Capital** : A nation may be bequeathed with a great structure of equipment, of factories and machinery, of roads and railways. This past legacy may give special facilities which may be as good and important as some oil-fields or other natural gifts.

(v) The mutual ratios between different kinds of resources differ largely from country to country. India and Pakistan have vast plains but lack capital which is indispensable for economic advancement.

(vi) **Political and Social Structure differs widely** : Moreover, grave dissimilarities can be found in the political and social structure of different nations. Some, due to their stable governments and conservative thinking, can easily achieve industrial advancement. Some institutions help a government in speeding up the rate of economic progress. Others discourage it and prove a bottle-neck in its way. Governments of backward countries, due to their instability and financial weakness, are unable to handle development projects more efficiently.

Thus, due to all these differences, some countries, possess absolute monopoly in the production of certain goods over other nations. They can produce them at the least possible cost, and even after the allowance is made for transport costs, they can supply these pro-

ducts at the cost which is quite below the cost at which these can be produced in the importing countries.

The Principle of comparative costs :

It is evident from above that certain countries enjoy absolute advantage over others in the production of various goods due to differences in their geographical and climatic conditions. factor immobility and institutional framework. But even if a country can produce, say, two commodities at a low cost than another country, it pays her to concentrate on the production of these goods in which she enjoys greater comparative advantage and imports the others in which she has comparative disadvantage. This notion of comparative advantage and disadvantage was expounded by David Ricardo and is called the "Law of Comparative costs".

We take an example to prove this case. "Very good grapes can be raised in Scotland, and very good wine too can be made from them, at about thirty times the expense for which at least equally good wine can be bought from foreign countries." Take another example. Suppose you cook food better than your servant. Still it may be worth you while to employ a servant for cooking, if the time and energy thus saved can be employed by you to more paying work in which the degree of advantage enjoyed by you over your cook is greater than you enjoy in the art of cooking."

Advantage of Trade : International trade has so many advantages in it.

(1) It helps in maximizing world's total production through specialisation (2) Consumption is also maximised. People can purchase from the cheapest possible market. (3) For some countries, trade is a matter of life and death. For example, Great Britain depends for food-stuffs entirely upon external trade. (4) Highest welfare can be achieved through International trade. U.S.A. is a well-advanced country but for some commodities it has to conduct trade with other countries (5) International trade puts off the operation of the law of diminishing returns. Thus world can enjoy abundant quantities of goods and service at reasonably low costs due to better allocation of resources and right factor combination for low-cost production. (6) It makes the home Entrepreneurs efficient and competent. Their tendency to exploit people is checked to a greater

(*Continued on page* 13)

Dr. Muhammad Ramzan,

WOMAN IN ISLAM

(A Psychological Analysis)

'Woman the counter-part of man, susceptible to healthy and salutary influences, is a light-house, of virtue, whose one kiss (viz., a mother's kiss) accompanied with love and affection, imparts an ever-lasting bliss. She is a rocky fortress against Satan, which only can save the man while tossing among the stormy waves of passion.' She is the paragon of love, beauty, service and affection as a loving daughter and sister, a faithful wife and an affectionate and serving mother. She embodies the qualities of a sparkling jewel in the household diadem without which every thing else looks dull and gloomy. To cultivate her feminine qualities, Islam has laid great stress to bring her up very carefully and look after her with the utmost prudence. Otherwise, these qualities are bound to get stifled or directed to the wrong channels with the result that she might prove to be a curse to man of his own making rather than a boon. She should, therefore, be given the right type of education and coaching to cultivate her natural faculties. To give her spurious and perfunctory education to strut about offices and factories is to belie nature and ask for trouble. She was created for something much nobler than for a mere mess of pottage what the ultra-moderns will have us believe. There is no difference between man and woman as a human being—each one can attain the highest spiritual glory. But, there, certainly, is a lot as far as their activities are concerned. Man is not woman and woman is not man. Can you ethnically and physically deny it? Look at their builds, features and true sentiments. A cursory glance will reveal that each one was eternally made for a different job in the scheme of things formulated by God, being the wisest division of labour which must be obeyed.

'Everything in its place is best,
Rough hew it how we will'.

There is plurality in the uni-

verse in everything including assignments. If man is the bread-winner of the house by dint of his harder build, woman is the custodian of things more etherial.

'To be man's tender part was
woman made,
And in obeying Nature,
She best serves,
The purpose of Heaven.'

She has to beget, rightly bring up and truly educate the children with her life-blood and tender caresses. She has also to look after her husband who toils and sweats all the day long in the office or the field and comes back home in the evening care-torn and and distracted to be comforted and resusciated by his wife with a broad welcome smile on her face—not the usual female grin or angry roar which will cut him to the quick. She is as well responsible for creating a congenial atmosphere at home for her male partner and look after his repositories in his absence. What a delicate and onerous task she has been entrusted with by Nature ! Is she, therefore, going to take it up like a dutiful mother and obedient wife or cast it to the winds turning their abode into heaven or hell as she likes it ?

To give her wrong education and expect better results is the height of absurdity on the part of man. She is naturally a temperamental creature and if she is spurred up on the wrong path, she is liable to cause havoc for which man himself has to blame. Instances in this respect are too numerous in the modern society to be quoted here. If she honestly discharges the duties akin to her sex as referred to above, she is left with no time to take to any un-natural avocation or flirting about Her main haven is the home which she must adorn and look after with the requisite qualities endowed to her by God under the able guidance of her husband. Let her and the suffragettes, therefore, pause and ponder if they want peace of mind, peace at home and peace in the world. But, if, under un-natural impulses, she is going to throw over-board every thing serene and lawful, God alone help and guide us to the right path ! If she takes to manly jobs, one thing at least should sharply remind her that her internal hormones which bestow on her feminine looks and grace will be converted nearly into male hormones giving her a different even haggard form, may be supplied with hair. From this can be easily gleaned her deviation from her

innate moral commitments. The adage, 'The hand that rocks the cradle rules the world' describes her high position in the affairs of the world. She should, therefore, be duly proud of her feminine virtues in their full fructuation for the largest benefit of mankind rather than taking a selfish view of herself and hankering after a virtue of the fouler sort.

The above ideals can only be realised by imparing to her a truly religious education from the very start as enjoined by Islam. Any other kind of education gained afterwards with this end in view will be a part of the former and will not detract from its intrinsic values as it is sure to do otherwise.

'Marry a pious woman goes a saying of the Holy Prophet of Islam (Peace be on his soul) 'otherwise your hands will be smirched with dust all the time'. This is the corner-stone for a really happy life which we often over-look for ulterior motives and suffer afterwards not only domestically but nationally as well. Because, the childern who are the future members of the nation will be imbued with the spirit which their mother is going to inculcate in them. It is thus abundantly clear that she is neither going to be a good wife nor a good mother unless she is brought up as a good child from her infancy, nay, in-utero. The responsibility for her bringing up, education and coaching devolves on the parents (mostly mother), teachers and the governing body. The mention of the last is equally important because it is this body that lays down the academic courses for the people on the national basis. The criterion for good education must be in conformity with her eternal values as laid down by Islam. To convive at it and try to yoke her with man for ploughing the same furrow is to defeat the divine purpose for which she was created. The accruing results will amply prove it. One being asked, when perplexed with an indecent incident, if she liked that sort of life, a young nurse spontaneously replied, "No, but it is the fault of my parents who gave me this education, and, now, I can't sit at home".

Ijaz-ul-Haq Qureshi

ON LIBERTY

Liberty is the birth right of every individual and with this in mind man has been struggling over the aeons, for the acquisition of liberty. In his attempt to gain national freedom, man has attained a lot while freedom of thought is still denied to him in many countries. It seems interesting to know how the process of liberty has evolved.

In the annals of history, the struggle for liberty can be traced in Greece, Rome and England where the masses were tyrannised and subjected to blood-curdling treatment by the prerogative classes. When the situation came to a head and the subjects could no longer endure this heartrending behaviour, a wave of indignation surged up among the people who now resolved to break the fetters of misery and affliction at any cost. By liberty was meant, at that time, protection against the tyranny of political rulers. The patriots of the time aimed at restraining the powers of the rulers so that they may not exercise excessive tyranny. For this purpose they got, in the first place, recognition of certain rights for the community and secondly they tried to establish constitutional checks by which the consent of the community was essential for enactment of regulations by the rulers.

But even the concession of these grants did not pacify the standard-bearers of liberty and they raised hue and cry against the continuance of despotism. They cherished to see the termination of despotic monarchs and its substitution by elected rulers who should be indentified with the people and whose interest and will may be the interest and will of the community. The demand for democracy gained currency everywhere. By and by democratic republics came into existence and elected responsible government came to occupy a large portion of earth's surface. "Every man and every body of men on earth, "says Thomson Jefferson, the third president of U.S A., "possess the right of self-government," so the people's

aspiration for self-government without which, according to Tocqueville, a nation cannot have the spirit of liberty was fulfilled at last.

Experience, however, pointed out that phrases like "self-government" and "the power of the people over themselves" do not interpret true sort of liberty. It was realized that the privileges of the majorities were detrimental to the minorities. Slogans like "there is no tyranny like the tyranny of majority" were raised and the state had to provide safe-guards for the minorities, too. Every kind of privilege was abrogated to establish real sort of liberty. "We must abolish everything that bears even the semblance of privilege," declared Woodrow Wilson, the embodiment of liberty. The distinction between princes and subjects, nobles and roturiers, men and women were put to an end. The likes and dislikes of society were held to be the main thing which determined rules and regulations for the good conduct of the goverment.

The United States of America is the pioneer in this field because it was here that man first breathed the air of freedom, equality and fraternity. It was proclaimed in its Declaration of Independence that, "We hold these truths to be self-evident, that all men are created equal, that they are endowed by their Creator with certain unalienable rights, that among these are life, liberty and the pursuits of happiness." America, now-a-days, is the most zealous supporter of liberty and others look to her for the maintenance of their liberty as Harry S.Truman wrote in his message to Congress, on March 12, 1947, "The free peoples of the world look to us for support in maintaining their freedom."

So far we have dealt with physical freedom but there is yet another kind of freedom — the freedom of conscience and thought which according to Allama Iqbal is tantamount to royalty. Man realized that there should be absolute freedom of opinion and sentiment on scientific, moral and theological problems. The individual should be free in his tastes and pursuits and in framing the plan of his life to suit his own character. "No society in which these liberties are not on the whole respected," says J. S. Mill, "is free, whatever may be its form of government and none is completly free in which they do not exist absolute and unqualified."

Freedom of thought is of

utmost significance in the world of politics. Great thinkers have all been bringing about great and revolutionary thoughts to the world. Such people are generally dreaded by the authorities For instance, Garibaldi, the Italian patriot, was put behind the bars because he thought too much and the government did not let people think for themselves. But if there had been no independent thinking the progress of the world would have come to an end. Today Russia would not have been there but for Marx and Lenin. Thus it transpires that the thoughts of a few individuals can move countries and nations, provided they are good enough to do that. This is why the Communists, even now, do not allow freedom of thought. They are afraid that it would lead to a counter-revolution. For the same purpose, they have banned *Dr. Zhigov*, a novel written by Pasternack. In their opinion, this novel shows the inner and spiritual unrest of the people, so better nip it in its very bud. China and all other communist countries are with Russia in this campaign and are carrying on a large scale fight for thought control.

England, U.S.A. and some other western countries, on the other hand, believe in freedom of thought. This has greatly helped these countries to give a fuller religious and social freedom to their subjects and to encourage a healthy growth of new ideas. By the adoption of this measure, the state can know, sympathise and help in fulfilling the aspirations of its masses. The cogenial atmosphere of give and take engenders feelings of mutual co-operation and good will and the country concerned gains ground by leaps and bounds. On the contrary, if people are not allowed to express themselves freely and their opinions are made light of, the steam of rancour against the authorities would go on gaining pressure and eventually burst out in the form of a revolt. India saw such mutiny in 1857 and Russia in 1917. So the subjects must be allowed freedom of thought.

Freedom of thought does not, however, mean that a man should express his thoughts freely even if they are absolutely against the security, tranquillity and well-being of the community of which he is a member. One has to draw the line somewhere and say that this is the limit; anything said beyond this would not be permitted. For example no state can allow a man to disseminate disloyalty amongst its armed forces, to preach

arson, to call for a full-scale war against the government of his country and to create contemptuous feelings between different peoples living together as one community. But for this countries would be on the horns of a dilemma on account of day-to day rioting and disharmony among their subjects. "The only purpose," says Stuart Mill, "for which power can be rightfully exercised over any member of a civilised community is to prevent harm to others. His own good, physical or moral, is not a sufficient warrant." That is to say that an individual should be endowed with absolute independence in matters which concern only his own self. His opinions on matters other than this should be accepted if they are beneficial for the society otherwise rejected.

Liberty, on the whole, is of paramount importance for real progress of humanity. Man must be assisted and encouraged for attaining his indefeasible right of freedom. Moreover, the respect of humanity rests in the fact that man's chains of slavery and bondage are cut off. The world is progressing with the lightning speed and the days are not far when people of the whole world shall be enjoying liberty—physical and mental.

Continued from page 6

extent. (7) It is also held that fatal consequences of famines and droughts can be avoided through trade relations. The absence of trade relations between Bengal and Burma brought millions of Bengallese to death in the famine of 1943. (8) Under-developed countries need skilled labour like engineers and other technical workers. When they import capital goods, technicians also come along with capital.

COLLEGE ROUND UP

It is with a mixed feeling of sorrow and happiness that we announce the departure of Professors Naseer Ahmad Khan M.Sc. and Hameedullah Zafar M. A. to England and Sierra Leone respectively. Professor Naseer Ahmad Khan left Pakistan in the end of September last to join the Durham University, where he will research in Nuclear Physics. Prof. Hameedullah Zafar will serve as a teacher missionary in Sierra Leone.

Both the professors have been outstanding members of the staff of our college. Al-Manar wishes them success and sincerely assures them that their absence is greatly felt.

Appointments :

Professor Chaudri Muhammad Ali M. A. has been appointed the President of Basketball Club of our college in place of Professor Naseer Ahmad Khan.

Professor Hameed Ahmad M.A. has been appointed the President of the Rowing Club in place of Professor Chaudri Muhammad Ali.

Professor Hameedullah of Mathematics, has been appointed Chief proctor of the college in place of Professor Basharat-ur-Rahman Professor Rafique Ahmad Saqib M.Sc. (Hons.) and Mr. Muhammad Ahmad Anwar B.A., D.P.E. are the new proctors.

Al-Manar congratulates them and hopes that the students will not fail to give them their full co-operation tc keep up the high traditions and discipline of the college.

College Results :

Mr. Ijazul Haq Qureshi stood first amongst boys in B.A. (Hons) Part II Examination of the Punjab University, securing 762 marks. It's worth mentioning that he has been holding distinction in the Punjab University for the last three years. Al-Manar congratulates him on his brilliant success and hopes that other students will follow

his suit and come out with flying colours.

Election of the College Union :

The college Union held its elections for the new session 1962-63 in the College Hall on 4th October 1962. Elections were held for various offices and class Representatives. The following are its new office-bearers :

Student President :
Arshad Trimazi

Secretary
Mashood Ahmad

Joint Secretary :
Munawar Ahmad

Assistant Secretary :
A. Shakoor Bhatti

Principal's Nominee :
Noor Muhammad Chandia

Science Society :

The election of the office-bearers for the Science Society was held on 7th October, 62. The following candidates were elected :

Vice President :
Abdul Subhan B.Sc. (Hons.) II Year

Secretary :
Munir Ahmad B.Sc. II Year

Jt. Secretary :
Abdul Hafeez XII Class

Class Representative
Nouroz Bhuya XI Class.

The Patron of this society is Prof. Habibullah Khan M.Sc.

Arabic Society :

The elections of this Society were held under the chairmanship of Prof. Aslam Sabir M. A. The following were elected :

President :
Abdur Raheem Hamid

Vice President :
Inamullah Qureshi

Seeretary :
Abdul Mannan

Joint Secretary :
Mubarak Ahmad.

Bazm-i-Urdu :

The Bazm-i-Urdu has elected the following Office-bearers for the new session :

President :
Abdul Samad

Vice President :
Ijaz Ahmad

Secretary :
Jamshed Mubariz

Assistant Secretary :
Mubashar Ahmad.

The opening ceremony of this

society was performed on 16th Oct. 62 by Mr. Hammad Raza, C.S.P. Commissioner Sargodha Division. In his short speech, he congratulated the College authorities for their praiseworthy performances. Stating the significance of Urdu, he also pointed out the importance of English as an international language.

Historical Society :

The election of this society were held on 24th Oct. 62 The following were elected :

President :
Ijazul Haq Qureshi B.A. (Hons) III Year.
Vice-President :
Mansoor Ahmad Sindhi
Secretary :
Mansoor Muzaffar
Assistant Secretary :
Naseer Mahmud

Economics Society :

The following are the newly elected office-bearers of Economics Society :

President :
Barkatullah Tahir B.A. (Hons.) Part III
Secretary :
Inayat Ullah Mangla B.A. (Hons) Part II
Joint Secretary :
Mumtaz Ahmad XII Class
Assistant Secretary :
Latif Ahmad Khan XI Class.

Biological Society :

The elections for the office-bearers of the Biological Society were held under the presidentship of Prof. Maqbool Ahmad M.Sc. The following were elected :

Vice President :
Mohammad Ashraf
Secretary :
Abbas Ahmad Malik
Assistant Secretary :
Nisar Ahmad
Financial Secretary :
Mohammad Nawaz.

Al-manar congratulates the newly elected office-bearers and prays that God may help them in doing their duty well.

Abdul Jalil Sadiq,

SCIENCE AND CIVILIZATION

Science is a way of thinking as much as civilization is a way of living. When man's reasoning faculty, in the dim past, was brought face to face with the objects of nature around him, science was born. This reasoning faculty in man, by conquering the secrets of nature brought about a change in the ways of living and thinking of the premature man in his natural surroundings of hills, dales, rivers, green belts of forest and long stretches of alluvial soil. With his instincts of self-preservation, first of all, he tried to save himself from the inclemency of weather and came to dwell in caves, sheltered from rain and enemies around him. Then began his nomadic existence, roaming the countryside in search of pasture lands for his cattle. Till at length he learnt the ways of agriculture and and settled down to a tribal society. Thus through bestiality, savagery and barbarism, man at last reached the stage of civilization with an organised society and political institution. Throughout this course of evolution of man as a social being, science has been helping towards his march of progress. He has scientifically used his brain power to domesticate fire, to till the soil for agricultural production, to discover the use of metals and turn them into objects of self-defence and offence against his enemies.

When society was stabilized, man's creative urge, which would always make him restless, goaded him on to find his own position in relation to the universe. The myriad of stars that twinkle on a clear night, the moon, the sun, huge hills kissing the sky, the gigantic waterfalls, overflowing rivers, forests, animal life that abound in them—all appeared to him with a significance whose purpose he, as yet with his underdeveloped reasoning faculty, could not fully realize. Thus the dim rudiments of astronomy began when he watched the movements of stars while he lay awake at night. When he saw the alternate change of day and night, and observed the cycle of seasons, he learnt when to harvest his crop in the field. Instead of straw and leaves, he began to use

stones and bricks to build his dwelling place. And in due course, with infinite patience, minute observations and experiments, he brought about for himself a civilized way of thinking.

Thus science as a hand-maiden of civilization had helped man in his urge to develop himself as the crown of creation.

Now in the twentieth century we find ourselves in the midst of a civilisation which has advanced in scientific discoveries and inventions beyond the imagination of the most visionary among our ancestors who lived even a century ago.

With the invention of steam as a tremendous power the days of sailing vessels were over. Steam engine created the railways which expanding on like the coils of a serpent covered the entire surface of the earth. And when steam was used as power in factories, the Industrial Revolution came. Then came other means of communications—telephone and telegraph. And with the invention of electricity and coal-gas we are in possession of all the amenities of a civilized life Petrol again gave us automobiles on the road. And electricity, as a slave, became our domestic servant to give us heat and light.

Thus with the invention of modern science, a novel civilization started in the world which has nothing in common with the civilization of the past. If we consider the glory of past civilization we think of them as separate entities flourishing for a time, reaching their zenith, and after that, fell, declined and disintegrated to give place to other civilisations. Thus the Chinese Civilisation, at a time, saw its hey-day and then gradually came its decay and dissolution. Where are the civilizations of Mohenjodaro, Assyria, Babylon, Egypt, Aztec, Greece and Rome? The perfume of their glory reaches us from their graves and antiquarians have to devote their life to unearth all the glories of those past dread civilizations.

Now after the Renaissance and Reformation, Europe became conscious of a political sentiment which we exalt as nationalism. The modern age has seen the development and growth of nationalism throughout the world with its stupendous discoveries and inventions of Science. But these blessings of Science have not been for us an

unalloyed happiness. The forces of Nature, which when harnessed by science for the benefit of humanity would have brought happiness and alleviated the sufferings and eradicated poverty, were employed in the Devil for the wholesale destruction of humanity. When nationalism became aggressive and showed its ugly head as the harbinger of colossal destruction, man realised that all the scientific inventions which created this modern life with telephones, wireless, aeroplanes, motor cars, railways, electric fans, and lights, sanitation and thousands of other amenities devised by machines, were dragging down humanity towards atavistic revolt against the very civilization they had created by means of science.

This destructive force, brought about by scientific inventions, has gone on unchecked through two global wars within a quarter of a century. Wars which used to be confined to the battle-front between two contending armies have now spread their field of devastation everywhere, in which civilian population, with innocent men. women and children, are to be victims of ruthless and gruesome weapons of wholesale destruction invented by science.

The world, because of aviation, has shrunk in size. We now talk in terms of One world and One Govt. The League of Nations preached internationalism and peace. So does the U.N.O. But are we nearer to our goal of this peace on earth and good will towards humanity? The cold war between Communism and the forces of Democracy, which had been going on ever since the cessation of hostilities of the World War II, has turned into hot war with the Korean War.

Then what have we done with our mighty civilization brought about by all the scientific inventions of the modern age? We have build sky scrapers, linked the entire globe with intricate ramifications of Telephone and Telegraph wire ; we have sent our aeroplanes buzzing through the air, we have created a veritable babel in the ether by incessant propaganda through hundreds of broadcasting stations from every corner of our earth. Then we have railways linking the land surface, ships that cross the seven seas and motor-cars that run through macadamised roads. Again we have newspapers, books in millions, produced by scientific machines, but are we one inch nearer to that peace and tranquillity of life for which

unalloyed happiness. The forces of Nature, which when harnessed by science for the benefit of humanity would have brought happiness and alleviated the sufferings and eradicated poverty, were employed in the Devil for the wholesale destruction of humanity. When nationalism became aggressive and showed its ugly head as the harbinger of colossal destruction, man realised that all the scientific inventions which created this modern life with telephones, wireless, aeroplanes, motor cars, railways, electric fans, and lights, sanitation and thousands of other amenities devised by machines, were dragging down humanity towards atavistic revolt against the very civilization they had created by means of science.

This destructive force, brought about by scientific inventions, has gone on unchecked through two global wars within a quarter of a century. Wars which used to be confined to the battle-front between two contending armies have now spread their field of devastation everywhere, in which civilian population, with innocent men. women and children, are to be victims of ruthless and gruesome weapons of wholesale destruction invented by science.

The world, because of aviation, has shrunk in size. We now talk in terms of One world and One Govt. The League of Nations preached internationalism and peace. So does the U.N.O. But are we nearer to our goal of this peace on earth and good will towards humanity? The cold war between Communism and the forces of Democracy, which had been going on ever since the cessation of hostilities of the World War II, has turned into hot war with the Korean War.

Then what have we done with our mighty civilization brought about by all the scientific inventions of the modern age? We have build sky scrapers, linked the entire globe with intricate ramifications of Telephone and Telegraph wire ; we have sent our aeroplanes buzzing through the air, we have created a veritable babel in the ether by incessant propaganda through hundreds of broadcasting stations from every corner of our earth. Then we have railways linking the land surface, ships that cross the seven seas and motor-cars that run through macadamised roads. Again we have newspapers, books in millions, produced by scientific machines, but are we one inch nearer to that peace and tranquillity of life for which

alone civilization stands?

In the meantime war clouds are gathering in the horizon. How can we save this civilization from wholesale destruction? The bombs and missiles are no solution of the problem.

If we are to survive, we must pin our faith in the noble ideals of U.N.O. Truth and non-violence are the beacon-lights for humanity. We must follow the path of peace enunciated by Islam. Otherwise this materialism brought about by scientific inventions will itself go beyond our control and carry on its colossal work of destruction, out of which no nation would survive on the face of the earth.

What does say Napoleon ?

1. Love of country is the first virtue of civilized men.
2. The true wisdom of a nation is experience.
3. The heart of a statesman should be in his head.
4. Politics is fate.
5. Courage is like love : it feeds on hope.
6. Men are moved by two levers only: fear and self-interest.
7. Serving the fatherland is a religion.

(Ghulam Rasul Ashna B.A. Part II)

A. Rafey Jafree

Uganda's Wild Life Conservations

Uganda is as rich in wild life and natural beauty as any country in the world. It has been an important aim of the Protectorate Government both to institute schemes for the control and conservation of wild life, and also to educate the people to a proper understanding of the purpose of these measures. It is only too easy to regard the elephant and the lion as enemies or the rhino and crocodile skin as easy and legitimate forms of profit making; to forget that wild animals have a place in the natural scheme of things and that indiscriminate slaughter can lead to the extinction of many valuable species.

Many people today must be familar, through books and films, with the richness of Uganda's famous animal life. Among the many species found here, are the giraffe, the hippos, the crocodiles, the African Elephants, the lions, the rare white rhino and many other representatives of the teaming wild life of the Kazinga Channel or Murchison Falls Park. There are two national parks in Uganda where the wild life is under the strict protection of the game wardens. Both are in the west of the country : the Murchison Falls Park covers some 1,000 square miles astride the Nile, below the point where it passes through Lake Albert and including the falls which constitute one of the finest spectacles in Africa ; and Queen Elizabeth Park, slightly smaller, bordering the North—East shores of Lake Edward, and including much of the Kazinga Channel and the weird crater lakes in the foothills of the Ruwenzort mountain range. Naturalists and visitors from Uganda and from all over the world come in growing numbers to stay in the simple but comfortable lodges in the game parks. Important scientific research is also carried out—much of it in liaison with Makerere. A third park is now planned by the Independent Government, in the North of Karamoja.

Wild life conservation is not, however, restricted to the national parks. Certain rare species are protected wherever they are. A

few years ago the white rhino seemed faced with extinction, for its horn was held in such a value by traders that it was being slaughtered mercilessly. Now the white rhino is protected and none may kill it and though poachers still succeed in getting away with a few, at least its numbers are beginning to recover. In Uganda it used to be found, chiefly in the upper reaches of the Nile, towards the Sudan border, but it is now being brought down to the more easily protected confines of Murchison Falls Park. As the adult white rhino weighs up to four tons, and he must be caught, crated and transported long distances by lorry over dirt roads, this is a considerable undertaking. Like the white rhino the gorilla seemed at one time to be on the verge of extintion. In Uganda it is now very rare, but it is, protected and some species are still to be found on the foothills of the Kiunga volcanoes, close to the Congo Border.

Big game hunting is now strictly controlled and hunters are limited in both the nature and number of their quarry. There is no doubt, however, that both, big game hunters and more pacific observers of Uganda's natural life are valuable contributors to Uganda's economy, for they make up the greater part of the tourist trade.

---

1. Never use bad means for attaining a good thing.
(Calto)
2. He who praises himself has always to face ignominy.
(Plato)
3. Doing harm to others is worse than suffering harm by oneself.
(Socrates)
4. Disappointment is the cause of pre-mature death.
(Aristotle)

Ataur Raheem Hamid

BLOOD OF HOMOSAPIEN

Blood is the most essential factor for the nourishment of our body. factor are certain vital functions which are performed by blood.

As regards its structure, it is included in simple connective tissues. For the conveyance of this essential substance there is a marvellous system in the human body termed as the blood vascular system.

Blood is made up of a ground substance known as plasma. This plasma corresponds to the matrix of other connective tissues. In the matrix there are two major types of corpuscles, the Leucocytes and the Erythrocytes. The Leucocytes are less in number. The Leucocytes and Erythrocytes are responsible for the various functions to be performed later on. In addition to these corpuscles there are some Antibodies which prevent the second attack of certain diseases. The red colour of blood is due to a substance, the Haemoglobin, which is the real factor for respiration in our body. The plasma is a colourless liquid which is composed of certain salts and water etc. The functions of blood are explained as under :

1. *Conveyance of Food :* The blood is the essence of food. When it reaches to each and every cell of our body through a dense network of blood capillaries it conveys the food to those cells.

2. *Conveyance of Oxygen :* The Oxygenated blood carries Oxygen to the cells and takes Carbon Dioxide in return for expulsion.

3. *Conveyance of Raw Material:* The stream of blood carries a lot of raw material to the endocrinal glands, so that they may synthesize their secretions.

4. *Conveyance of Hormones :* The blood absorbs the hormones of glands and distributes them to the needing quarters of the body.

5. *Defence against diseases :* The Leucocytes of the blood are a great boon. A kind of them, the Phagocytes, devour up the germs through the process of Phagocytosis and this decreases the danger of diseases to the minimum.

6. *Help in Excretory System :* The impure blood which carries Carbon Dioxide with it, comes to lungs where it receives iresh Oxygen from the air, Carbon Dioxide is expelled and the blood is oxygenated to remove impurities. Then the purified blood is distributed in all parts of the body.

7. *Coagulation of Blood :* It is a very useful phenomenon occuring in the human bodies. There are cases when the blood begins to flow accidentally and if this flow of blood is not checked, the consequence might be very dangerous and fatal. The analysis of the phenomenon describes that one of the constituents of blood, the thrombocytes gather round a wound involuntarily. These thrombocytes secrete thrombokinese which acts upon the prothrombin of the blood and converts it into thrombin. The thrombin then acts upon the fribrnogen of the blood and leaves it as fibrin. These fibrin then entangles the leucocytes and erthrocytes to form a clot, which becomes a resistance for the over flow of blood. Imagine, what a marvellous deed of nature it is !

The above mentioned facts explain the wonderful mechanism of blood system in man.

---

1. There are tragedies in life and in the march towards the future but life isn't, in itself, a tragedy.
(Mr. Sean O'Casey)
2. Contentment is natural wealth, luxury is artificial poverty.
(Socrates)

Ata-ul-Mujeeb Rashad

FREEDOM OF CONSCIENCE

This universe was created for human beings to exhibit their mental and physical abilities. But man cannot work efficiently if he is not free. Freedom is of different types. The most important of them is freedom of conscience.

Freedom, as a common conception needs no explanation. But the term conscience is more or less ambiguous. Conscience refers to those inner motives which lead us to honesty and adjust our behaviour according to purified moral values. One may be a sinner but his conscience may remain unaffected by his immoral conduct. We come across a well known story that a thief was asked about his activities and companions. When the questioner asked him under whose custody he kept his stolen commodity, he replied that his friends used to perform that duty. Once he was asked, if his friends went against the qualities of an honest custodian, what would happen ? He replied that that unsocial and criminal action could never be performed by his fellowmen. This was the voice of his conscience. Although he himself was a thief yet he could not but condemn stealing when he was asked in a different and indirect manner.

Since the creation of this world, man has been struggling hard against those factors which impose restrictions upon the freedom of conscience. Men have preferred death and made great sacrifice for the sake of their cherished beliefs. Socrates drank the cup of hemlock to vindicate not only his integrity of character but also the truth of his sacred ideas. Galileo suffered tortures behind prison bars because he had a strong conviction of his thoughts. He proclaimed that the earth is round and moves round the sun. But as it went contrary to the established beliefs of the people they did not agree to alter the faith inherited from their forefathers, although it was proved baseless and ridiculous. He was, therefore, forced to change his opinion. Crushed under the weight of torture he once said that the

earth was stationary but in the same breath he declared ; "No, no, it moves round the sun."

Today we regard such personalities as benefactors of mankind. This is merely because of their dauntlessness that they declared openly what was right according to their own belief. We can easily conclude that the efforts of such famous and historic personalities have brought us to the most scientifically developed era. It is an indirect consequence of their wishes to achieve the freedom of conscience.

So the importance of the freedom of conscience is quite evident. It should be maintained and recognized at any rate. It stimulates humanity towards its goal and causes enlightment in our minds. Hence it is the fundamental stone of our moral and spiritual progress.

---

1. Silence adds to the dignity of man.
2. Look to yourself with the eye with which other people look to you.
3. Good memory is an invaluable treasure.
4. Exchange of ideas is the best way of learning.
5. No time is better than present.
6. A sagacious man is he who holds up his tongue from the blame of others.

Abdul Mannan XII Class

Maqbool Malik

BACTERIA

Bacteria are very minute, unicellular organisms with a primitive state of organisation. These are invisible to the naked eye, and can be examined only under a very powerful miscroscope.

Anton Van Leeuwenhoek of Holland was the first to discover bacteria, in 1675. Then Pasteur (1822—1695) demonstrated their great role played in fermentation and decay. Several diseases as anthrax (disease of cattles,) Asiatic Cholera, (the disease of human being) etc.. are caused by these bacteria.

Their significance can now be well-realised, particularly since 100 years, as a vast knowledge about them has been accumulated.

Bacteria were placed in a class, schizomycetes of order Eubacteriales but all the bacterium are grouped in a separate phylum schizomcophyta. They are devoid of chlorophyll, and reproduce by binary fission.

A single bacterium is, generally 1.25 u (1u = 1/1000th of a millimeter) in diameter. It is estimated that a handful of garden soil contains more bacteria than there are human beings on earth.

Some interesting calculations have been made about bacteria, which are as follows :

A single drop of water may contain fifty billion of them. A coccus (spherical bacteria) measuring 1*u* across, if magnified 500 times, would measure 0.2 inches when a well-built man on the same scale would measure 2540 yards tall and more than a thousand yards broad at the shoulders. Nearly 500,000,000,000 bacteria would weigh 1 gram.

The amount of heat required for bacterial activity is very varied. For common species the minimum temperature is 1°—10°C, the optimum temperature 25°—35°C, and the maximum 40°—50°C. Many species live at a higher tempera-

ture than these, but the majority die when it is raised to about 55°C. All are killed by boiling water when they are in the active condition, but the spores can withstand prolonged boiling. Bacteria can resist very low temperatures. At 0°C, the freezing point of water, activity is suspended, because the activity of protoplasm itself is checked at this temperature. But the bacteria are not killed, and they become active again when the temperature rises.

The minute structure of bacteria has very important consequences. The large surface of bacteria in proportion to their weight enables them to absorb great amounts of food and bring about chemical changes at an amazingly high order.

Forms of Bacteria :

Basically the bacteria are classified into three forms.

(a) *Cocci* : which are spherical, these generally exist in colonies, but if they occur singly each of them is called "micrococous".

(b) *Bacilli* : These are the commonest, and are usually straight and cigarette shaped.

(c) *Spirilla* : These are coiled like a cork-screw.

Movement : Motile bacteria, generally move by means of whip-like structure, the flagella Flagellar movement in certain bacteria occurs at high speed, some can travel 2,000 times of their own size within an hour.

Reproduction : Bacteria always reproduce asexually by equal division followed by rapid growth. The reproduction takes place by means of transverse fission and spore-formation. Its life cycle is graphically represented here.

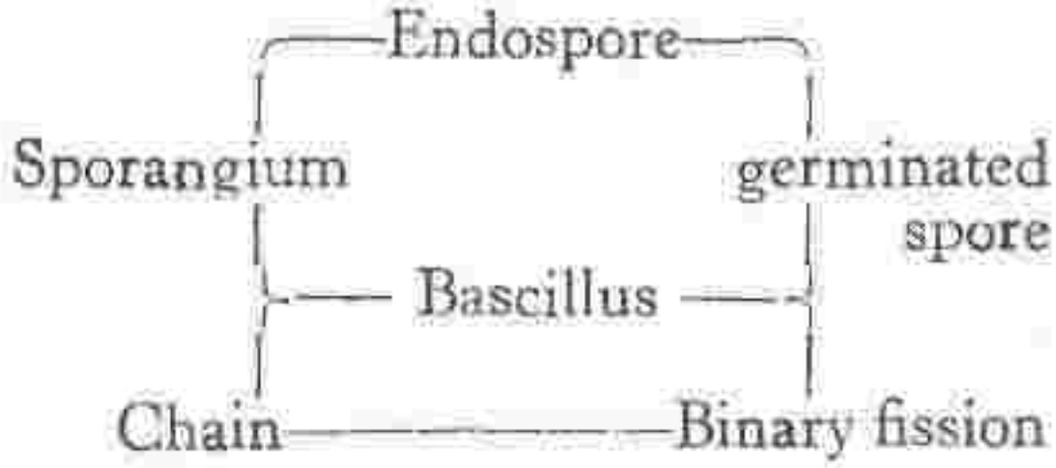

(A)

(B)

(A) Spore-formation forms.

(B) Non-spore formation forms.

Economic Importance.

A large number of animal and plants diseases are caused by bacteria.

Some of the human diseases caused by them are tuberculosis, diphtheria, cholera, lock jaw etc. Some of the animal diseases are anthrax, chicken cholera, tuberculosis of cattle. Some plant diseases caused by bacteria are : Wilt of tobacco, citras canker, and soft rot of carrot.

Clostridium botulinum (a type of bacteria) produces a very virulent poison in canned food, and many deaths occur due to it.

These are few instances of the harmful activities of bacteria, but on the contrary, their beneficial activities are so considerable that they easily outweigh the harm that they do.

They, along with fungi, help n preventing the accumulation of dead organic matter by causing their decomposition. Thus, they, rid the world of the useless remains of dead animals and plants, and at the same time give the soil its useful supply of humus.

Rhizobium (a bacterial type) present in the root nodules of leguminous plants or Azotobacter in soil are capable of fixing atmospheric nitrogen and thus increasing its fertility.

The curdling of milk, preparation of cheese, butter or cream, and fermentation of alcohol are all dependent upon the activity of bacteria.

Several antibiotics, such as, streptomycin, aureomycin, choromycetin, etc., are obtained from certain actinomycetous bacteria.

---

1. The best among you is he who learns the Holy Quran himself and teaches others, too.
2. Learning knowledge is incumbent upon every one.

(The Holy Prophet)

3. A sound mind in a sound body, is a short but happy description of a happy state in this world. he that has these two has little more to wish for (Socrates)

Fazal Ahmad

Why Pain in Twentieth Century?

Modern Society and its drawbacks are the underlying features of this article. To give it an understandable skeleton it has been reduced into question-answer controversy as being held by a thinker of this age.

Note : The Editors may not necessarily agree to the writer's views—(Ed.)

Question : Society today is far more advanced than that of any other age and our economy is advancing in the path of progress with even greater leaps, but what we generally see around us are spectacles of a barbaric age. Is it not a fact that pain and suffering today is intenser than in the past ages ?

Answer : That is an important question no doubt, but how do we regard ourselves superior to our ancestors ? In a general way we are more advanced, more sensitive, and more progressive. Today man is not the same man as he was centuries ago. Today he is an artificial man living in an artificial world of sensations and desires, motivated rather by the artificiality of life than by its naturalness. (Here we may classify things made by man with his own hands as artificial). History proves that slowly and steadily human beings have built an artificial world around themselves. Surrounded by such artificialities people in this age are leading an artificial life.

Question : What is the effect of this artificiality ?

Answer : Yes, I was going to deal with this aspect of the problem myself. This reminds me of experiments in animal psychology. Under artificial circumstances, animals are apt to be motivated in their natural actions by artificial causes. Continued, this will alter the natural movements of the animals under artificial habits.

Such is also the case of man. When an artificial world has been erected around the masses, their actions, desires, and instincts tend to become moderated as their environments require and obviously affect the character of his life.

Had all this artificiality been for the good of man, that is to say, of constructive use to him, well and good. But contrary to that we see pain and suffering. To answer this we must go back to our premises—erection of the artificial along with the natural. This process of erection was not a conscious one. It was not controlled, guided and directed by man, specially with the object and set purpose of constructive use. It was rather haphazard, criss-crossed and misguided. This is what you call the History of man.

The result is that the artificial world today is far more removed from its natural tempo of smoothness and orderliness. Whether we blame the politicians or anyone else for landing us into this mess of confusion and disorder, today there are far more causes for being devoid of spiritual and mental peace. We may classify the causes into 2 main heads: (1) natural (2) artificial.

Under natural causes we may mention those wrought by Nature while turning the wheel of life—whatever may be crushed under it. Under artificial we may mention the aims of capitalists, Communists, expansionists etc.

It must be noted however that artificial causes are not the absolute opposite of natural ones. The care of artifical causes is like one that of a top, which previously was spinning on its axis and now is spinning on its sides, but continues to spin all the same.

Living in a world of limited means, when our ends have been increased and enlarged on account of the addition of artificial ones to the already existing natural ones, it becomes all the more difficult to breathe through a narrowed passage with increasing pressure from all sides. Such is the end prescribed for greedy man in the Holy Quran—he will have a suffocating pressure around his neck and will breathe his unhappy life no more.